

یادِ ویوِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

یاد و بودِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ اے آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق تعلق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداواد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے عقلی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تفسیر سے رہا ہے۔ مقدس تصفیروں کے علاوہ خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر و رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تکمیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھاپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے صفحہ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتاب میں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قوی کو نسل برائے فرد و اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

سادہ دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کوفل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر و معزز زبان میں اچھی فصاحت اور غیر فصاحتی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کوفل نے مختلف انواع موضوعات پر طبع زد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے اور اپنی تکفیل کے بعد قومی کوفل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کوفل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات غور مست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو غلطی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کوفل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت سندھ، سندھ، پاکستان

فہرست

۹	غالب کی عظمت	-۱ ۱
۱۷	غالب اور بے صبر	-۱ ۲
۲۸	غالب اور آذرہ	-۱ ۳
۳۷	غالب کی شخصیت اور شاعری	-۱ ۴
	میں	
	ترکی، ایرانی عناصر	
۵۶	غالب کا مقدمہ پیش	-۱ ۵
۷۱	غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات	-۱ ۶
	حضرت غمیگین کے ساتھ	
۸۱	غالب کا سکہ شعر	-۱ ۷
۹۶	معرکہ غالب و ماسیان قتل	-۱ ۸
	ایرانی، ہندی نزاع کی روشنی میں	
۱۱۵	غالب کی دلی	-۱ ۹

غالب کی عظمت

آج کا دن ہماری تاریخ ادب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اس روز قلم سخن کے تاجدار مرزا اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہی نہیں ہوا، بلکہ پورے ایک دور، ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ دور عبارت ہے فیض اور رحیم کی شاعری سے، عبدالصمد کی مصتری سے اور سیکری اور تاج محل کی صناعتی اور خوبصورتی سے، مرزا غالب اس محفل کی آخری شمع تھے، لیکن وہ ایک دور کے خاتمہ ہی نہیں، ایک نئے دور کے پیش رو بھی ہیں۔ ادب سے جو نئی بنیادیں انھوں نے قائم کیں، جدید نثر اور جدید شاعری کا ایرانِ رفیع اسی پر تیار کیا گیا ہے۔

مرزا غالب نے جس وقت بیوش کی آنکھ کھولی، مغلیہ سلطنت کی شمع نثار رہی تھی؛ لارڈ ویک کی فوجیں دلی ناک پہنچ گئی تھیں، انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور شہنشاہِ عالم اور عالمیان کی حکومت قلعہ معلیٰ تک رہ گئی تھی، پرانا نظام کمزور اور بے دست ہو گیا تھا اور نئے کی گرفت دن بدن مضبوط ہوتی جاتی تھی، لیکن ابھی قدیم نظام حیات کی دلچسپی کم نہ ہوئی تھی بلکہ تبدیل شدہ حالات نے اس محبت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ آویزش اور پیکار تھا جو اسماعیل شہید سے شروع ہو کر غدر پر ختم ہوا، غدر سے مرزا غالب کی دنات تک پرانا نظام حیات و ہم پریم تو ہوتا رہا لیکن نیا دور میں نہیں آیا، پرانی قدریں منضحل ہو کر ختم تو ہونے لگیں، لیکن نسلی

وجود میں نہیں آئیں، اس وقت نقش جاوہر آپیدا تھا اور زندگی منزل و محل سے بے نیاز تھی۔

اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں، جب موجِ خوں ہمارے سر سے گذر رہی تھی، مرزا غالب نے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا، انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اس کا ایک حوصلہ اور ایک ہمت عطا کی، انھوں نے تیرگیِ شام کو نورِ سحر قرار دیا اور اس طرح ہمیں ظلمت کے برواشت کرنے کا اہل بنا دیا۔

غالب کی پرورش نہایت شاندار ماحول میں ہوئی تھی، جہاں ہمیشہ امروز کے سارے وسائل و ذرائع موجود تھے یعنی شاہدِ شمع و ستارے و تمار، لیکن یہ فضا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی، اب سرشکری کا موقع نہیں تھا، صرف سخن گسری کا موقع تھا، اس لیے انھوں نے اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے شعر و سخن کا راستہ اختیار کیا جس کا ذوق وہ ازل سے لائے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں "آئینہ زودون و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است" یہی وجہ ہے کہ تورانیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے، اس قلم میں تلوار کی سی تیزی اور برش بھی آگئی ہے جس کا آدای اور جرأت کے ساتھ مولانا اسماعیل شہید نے اپنی اصلاحی تحریک شروع کی تھی، اور رسوم و معاشرت میں تقلید کی بُرائی، اسی آزاوی کے ساتھ غالب نے فنِ لغت اور فنِ شعر گوئی میں استادوں پر آذوائے نکتہ چینی کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں "ہر برائی لکبیر صراطِ مستقیم نہیں ہے" اور اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہ پوری طرح سند نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب نے شعر و ادب میں ماضی کے سرمایے سے قطع نظر نہیں کیا، حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے بے وسعت پیدا کی، عبدالحق صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ اگر غالب نہ ہوتے تو حاقی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ یونان کے دیوتا کی طرح ان کا ایک رخ ماضی کی طرف ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف۔ غالب غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے، ان کی عظمت کا راز ان کی رنگارنگی، ان کی وکٹن انفرادیت، ان کی انسان دوستی اور ان کی آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ وہ

بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک بھرپور انسان تھے، جسمانی، تہذیبی، اخلاقی، بشریت
 خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی، انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نقاب نہیں
 ڈالے اور پردے کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا، وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو
 ظاہر کرتے ہیں، یہی بیاک صداقت، جذبہ زندگی اور سنجیدہ ظرافت اور ادب کا
 سب سے بڑا سرمایہ ہے، انھوں نے نئے نظام اور نئے زمانے کی اس وقت تائید کی
 جب سرسید کو بھی اس کی جرات نہیں تھی، انھوں نے قتیل، برہان قاطع اور نواب
 کلب علی خاں کے جوابات اسی طرح دیے، جس طرح ترک اور تورانی لڑتے ہیں،
 کسی جگہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

اس پر آشوب زمانے میں خود مرزا کی زندگی بڑی پر آشوب گزری، وہ اگرہ
 کے خم کہانیاں سے نکل کر دی آئے تو یہاں شاعر اور، سے معز آرا ہوئے، انھوں نے
 ذوق کی ساقی، تحریک کو مانا لیکن اس کو ٹھیکمانہ نظر بھی دی، لگاتار گئے تو وہاں قتیل کے
 حلقہ جوشوں سے برسرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزاع میں کور پڑے ہو
 قیسی اور عرفی اور شیخ علی حوٰجی اور خان آرزو کے زمانے سے ہماری تھی، مرزا نے
 اس میں بھی، سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراج تحسین ساهل کیا۔ پھر ان کی
 پٹیشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں تیس برس تک الجھے رہے۔ یہ صرف روپیہ کا
 معاملہ نہیں تھا، خانہ دانی حق اور دجاہت کا بھی سوال تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی
 خدمت میں حینیاں بھیجیں اور حکام کو خوش کرنے کی بیش از بیش کوشش کی لیکن
 یہاں بھی سوال شنا کوئی اور مدح گسٹری سے زیادہ، جینہ و مسرتیج و مالاس مرادیر کا
 تھا یا دربارِ لبر اور خلعت کا۔

اس وقت وہ تمام روشنیاں جن سے فطرت کہدھیات میں روشنی تھی، ایک ایک
 کر کے گل ہو رہی تھیں، وہ تمام قدریں جو مرزا کو بے حد عزیز تھیں ایک ایک کر کے نہیم
 اور سمار ہو رہی تھیں لیکن ان کے کلام میں فریاد اور بغاوت پیدا نہیں ہو سکی، اور یہ
 ادنیٰ بات نہیں ہے۔ اگر گلشنِ ہند کی روایت صحیح ہے تو میر تقی میر کو تین سو روپے ماہوار
 ملتے رہے، لیکن مرزا غالب کی "ذاتی ادارت" ہمیشہ ایک اختلافی مسئلہ رہی اور جب

اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کا وقت آیا تو اس کی "ماہیت" باسٹھ روپیہ آٹھ آنے سے زیادہ نہ نکلی۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں وہ "کلیت اور مشیت" پیدا نہ ہو سکی کہ وہ آہ جگر گداز اور ناز و دل خراش کو حاصل زندگی سمجھنے لگتے۔

مرزا کی شخصیت میں جو چیز غیر معمولی کشش اور دلآویزی رکھتی ہے وہ ان کی بشریت ہے اور اس پر فخر و ناز ہے۔ ان کے کلام میں عام انسانی مسائل اور الجھنوں کا بیان ہے اور انہیں اس کے اظہار میں مطلق پاک نہیں تھا کہ وہ عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں تھے۔ اگر آم نے سرواٹھرا لے گا ایک قول جیکب پیر کے متعلق نقل کیا ہے "وہ کم پاب ترین چیز تھا، یعنی ایک پورا انسان" غالب بھی کہتے ہیں،
خوئے آدم و آدم، آدم زادہ و آدم

سعدی کی طرح ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی ہوش مندی اور دنیا داری ہے جو اس دنیا کے بسنے والوں کو بہت عزیز ہے۔ اس آئینہ میں وہ اپنے ہی خط وخال دیکھتے ہیں اور ان کے دل کی داستان میں ان کو اپنی ہی سرگذشت کا لطف ملتا ہے۔ غالب کی شخصیت صرف پر شکوہ اور لائق احترام ہی نہیں بلکہ وہ ہمارے "ادب کی سب سے خوش صحبت ہستی" سے، آپ جس رنگ اور لباس میں بھی دہاں جائیں گے وہ آپ کو پہچان لے گی، آپ کے درد و دل سے واقف ہوگی اور آپ کی تسکین اور آسودگی کا سامان بہر پہنچائے گی۔ اسی لیے جہنوری نے لکھا تھا کہ لوح سے قسمت تک نکلنے سے تو صدمے ہیں لیکن کون سا فتنہ ہے جو یہاں نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف مرزا کی رنگارنگی اور بولوں کی شہرت ہے۔

بعض نقادوں نے مرزا کو ولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے شیطان، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک انسان تھا جو بشری کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالتا بلکہ انہی نمایم ہستہ کا خاں ہے۔

غالب سے پہلے آدو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و بیان کے کرشمے تھے لیکن وہ حسین اور نوح زبانیت نہیں تھی جو دیگر الفاذا میں روح چھوٹک

دنیا ہے، یہ مرزا کا عطیہ ہے اور اس پر آرد و بتا بھی فخر کرے کہم ہے۔ وہ اپنے تلمیم سراپے سے واقف تھے لیکن اس کی ہر رسم اور فید کے پابند نہیں تھے، اسی لیے ان کا شاعر، افسوں و افسانہ نہیں ہے۔ اس میں نفسِ گرم کی آسیرش ہے، خونِ جگر کا نم ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیئے، ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز، اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ اس میں مغل و مسلم کی شگفتگی ہے، اس کا پُر معنی اختصار ہے، اس کا ترکا نہ پاکپن ہے۔ یہ انداز و اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔ غالب نے غزل اور قصیدے کی خارجی قبا وہی رکھی ہے جو پہلے تھی لیکن ان میں ایک اندرونی انقلاب ضرور پیدا کر دیا ہے۔ ناسخ و نصیر کی دنیا ان تبدیلیوں کی اہمیت کو اچھی طرح نہ سمجھ پائی اور غالب کو یہ کہنا پڑا :

مرے دعوے پر یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں!

غالب نے نظریہ حسن و عشق کی تعمیر میں ان کی دراشت، ان کی شخصیت اور ان کے نسل و خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب کے چل کو بہار و تابشائے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں اور بابر کی طرح پیشِ سرور کو "زندگی" کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کا ذکر کیا ہے وہ ذہنی تجزیہ نہیں بلکہ تجربہ اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی مادی اور انسانی ہیں۔

غالب کی سیرت اور ان کا کردار مثالی نہیں ہے، ان میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن یہ خامیاں زیادہ تر ان کے طبقے اور ان کے زمانے کی خامیاں ہیں، تاہم ان کی ذکاوت کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ وہ اپنے ماحول کی خرابیوں سے باخبر نہیں تھے اور تخریب کے بعد تعمیر ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں جو مغربی تمدن کا، برکتوں کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین اور داد و دانش کا تعریف ملتی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے طبقے اور ماحول سے بلند ہو کر کبھی معاملات پر نظر ڈال سکتے تھے۔ غالب نے کلکتہ میں قیام کیا تھا جو اس وقت نئی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اگر وہ کے بعد وطن ان کا وطن تھا جس کو پرانی تہذیب کی علامت کہنا چاہیے لیکن یہاں قدیم و نئی کالج نے سائنسی علوم

کو اہمیت دے کر ایک نئی شمش جہت پیدا کر دی تھی۔ غالب کے ذہن کے نقش و نگار دراصل ان ہی دونوں جگہوں سے مستعار ہیں۔

مرزا غالب نے اردو شاعری ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں دیا، جدید اردو شاعری زیادہ بھی اپنے باہرکت ہاتھوں سے قائم کی۔ ان کے خطوط میں، ان کی شخصیت اور صبح عصر پر سے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہی گفتگو، بلند نظری اور اپنائی جو ان کی شاعری کی خصوصیت ہے، یہاں بھی کار فرما ہے۔ جس طرح ان کی غزل حدیث و براہ سے گذر کر مدیریت، زندگی بن گئی ہے، ایسے ہی ان کے خطوط میں زندگی کا سونا پگھلا ہوا نظر آتا ہے۔

مرزا اپنا راستہ خود طے کرتے ہیں۔ ان کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ خضر کی بھی پیرزی کو وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، ہنس، دادیوں میں جہاں ان کے پاؤں چلتے چلتے جواب دے گئے ہیں، وہ سینے کے بل راستہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رسم و رواج اور تقلید کے پابند نہیں ہیں، شیخ و برہمن ان کی نظر میں ایک ہیں، ان کے یہاں اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے، ملتیں اہم نہیں ہیں، ان کے مٹنے سے جو ایمان بننا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں ویر و حرم اور زنار و سیح کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہی نے خطوط میں بھی ہے۔ ”یہ تو بہنی آدم کو، مسلمان یا ہندو، یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔“ ان کے دوستوں میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی، کاشانہ اول کے ماہ دو ہفتہ، مرزا قاضی اور نور چشم میر محمدی اور انگریز بھی، جن میں کوئی ان کا امید کاہ تھا، کوئی دوست، کوئی یار اور کوئی شاگرد۔

مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا، وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا، وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ سال کے ہوئے تو جمع ہرگزوار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کو بے شک عشرت و عشرت میں سراپا لیکن اس کی ان کو قیمت بھی ادا کرنی پڑی، ترض خواہوں سے کبھی ان کو رہائی نہیں ملی، زندگی کے بہترین سال انھوں نے بائیس کی تک دو دو میں گزار دیئے۔ ان کے بھائی مرزا یوسف پگل ہو گئے، پچاس برس کی عمر میں خود جیل خانے گئے، ہزارارانوں کے بعد اس وقت مقرر ہوئے تو وہ بھی سال میں نہ وہ قدر باقی رہا اور نہ وہ ساقی، لیکن ان

حوادث کو وہ اپنے دریاے بے باقی کی ایک موجِ خون سمجھ کر برداشت کرنے رہے :
اس کیل کو انھوں نے بازو پھڑا اٹھا اور اپنی شائستہ ظرافت اور شگفتہ متانت سے
زندگی کو سنسالا بھنی اور سنوارا بھی۔

پریشانیوں اور مصیبتوں میں خود ہنسنا اور دوسرے کو ہسانا آسان نہیں ہے :
بے نیازانہ خوش طبعی اور غلی رواقیت خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مرزا آفتہ کو لکھتے ہیں :
”مجھ کو دیکھو : آزاد ہوں نہ مقتدر، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، خوش ہوں نہ ناخوش
نمرود ہوں نہ زندہ، بچے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھا آ ہوں،
شراب کھا کھا گاہ پیے جاتا ہوں، جب موت آئے گی، مرد ہوں گھا، نہ فکر ہے
نہ شکایت، جو تفر رہے برسبیل حکایت“

مرزا حاتم علی تہر کو تعزیت کا خط لکھتے ہیں۔ کیسا نازک موقع ہے لیکن دیکھیے :
”مرزا صاحب ! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ
مرے، کیسی اشک افشانی اور کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکوہ بجالاؤ اور غم
نہ کھاؤ۔ میں جب بہشت کا خیال کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی
اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اناست جاودانی ہے اور اسی ایک نیک نخت
کے ساتھ زندگانی ہے، اس خیال سے جی گھبراتا ہے، کلمہ جو منہ کو آتا ہے، ہے ہے
وہ حورا حیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی نمر دیں کلخ اور وہی ہلوی
کی ایک شاخ چغیرمہ دوز وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔“

مرزا آغا کی ایک ایک جملہ خیال انگیز ہے مرقع نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ یہ انداز
ظہوری و بیدگل یا مختارین اور جب علی بیگ سرحد سے مختلف ہے۔

”پانچ لشکر کا حملہ ہے پے پے اس شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر
کا اعتبار تھا، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و کمین
آسمان و زمین و آسمان ہستی سراسر ٹٹ گئے.....“
مرزا آفتہ کو لکھتے ہیں :

”تم نے روپیہ بھی کھویا، اور اپنی نیکو اور میری اصلاح کو بھی ڈبو دیا، ہائے
کیا بھری کاپی ہے اپنے اشعار کی، اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ
یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے، صورت ماہ و دو ہفتہ
کی سی، اور کپڑے میلے، پانچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ
بے تکلف ”سنبستان“ آیا۔ معشوق خوب رو ہے لیکن بد لباس۔
ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو :

”پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کو
شکوہ گزار پایا ہے، بس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی
کیا گنجائش ہے، بلکہ یہ غم تو نصیب دوستان درخور امنہ الیش
ہے..... اور اگر خدا نہ خواستہ غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد
ہو! ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے اس رنج کو مردانہ وار اٹھایا، ان
کے یہاں نفسہ شادی بھی ہے اور نومذغم بھی۔ ”ایک فلسفیانہ احساس ہے جس
میں رنج و راحت دونوں کی گنجائش ہے“ اور شاید دونوں کی آرزو، اُسی نے ان
کے بار حیات کو ہلکا کر دیا ہے اور یہی ان کا پیغام ہے، اگر غزل گو شاعر کو
کوئی پیغام ہو سکتا ہے۔

مرزا غالب کو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ یہ سعادت، یہ بزرگی، یہ عظمت

عام نہیں ہے۔ سعدی، ظہوری اور ملتان کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ مرتبہ حاصل
ہے۔ غالب کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل غیر فانی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن
اگر خاتم بدین دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہوتے، تب بھی ان کا
مرتبہ اُردو نثر پھر میں وہی ہوتا، جو آج ہے۔

غالب اور بے قصبر

غالب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان کے شاگردوں نے ان کے ساتھ جس محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا ہے، وہ اردو کے کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خود غالب کی شخصیت میں دل نوازی اور محبوبی کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔

ان کے شاگردوں میں منشی مال کنڈ بے قصبر سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ سوانح عمری بے قصبر میں لکھا ہے کہ وہ مرزا گڑیاں تفتہ کے بھانجے تھے اور "۱۸۱۰ء میں بہ مقام سکندر آباد پیدا ہوئے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کی ولادت کی تاریخ نہیں لکھی۔ البتہ وفات کی تاریخ بغیر حوالے کے ۱۸۹۰ء اور عیسوی شہر بس لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ مضمون سوانح عمری بے قصبر چونکہ بے قصبر کے چھوٹے بیٹے سری برہما سرور نے اور بے قصبر کے انتقال کے فوراً بعد لکھا ہے اس لیے

۱۔ سوانح عمری بے قصبر مقالہ پسر خود بے قصبر بحوالہ اردو ادب، ج ۱، ص ۲۶، ص ۹۲۔

۲۔ تلامذہ غالب، ص ۵۵

۳۔ ایضاً

(ہم ہے۔ اس میں نگاہ ہے :

" (بے صبر نے) پچھتر برس کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ)

فیروز پوری کو بھائی میرٹھ رحلت فرمائی :۱

مالک رام صاحب کے بیان سے بے صبر کی تاریخ ولادت ۱۸۸۲ء قرار پاتی ہے

لیکن مؤرخ الذکر نے اپنی تاریخ ولادت خود نکالی ہے جو اس بیان کے خلاف ہے۔

۱۸ سال ولادت ہندوئی میں جو کوئی صورت و معنی میں پائیے

تو کر دے قافیہ کو دور تا ہاتھ ہر دوشت حد شصت و نہ پائیے

(۱۸۶۹ ہندوئی)

بے صبر کا ترجمہ منشی دیو پرشاد جاش نے تذکرہ آثار الشعراء ہنود میں دیا ہے :

" بے صبر مختص منشی بال مکہ ولد لے کا نہنگہ کا یہ بھٹاگر سکندر آباد ضلع

بلند شہر۔ اب عمر قریب ستر برس کے ہے۔ پندرہ برس کے سن سے اب تک

شعر کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب کے شاگرد ہیں۔ صاحب دیوان

اور تصنیفات متعددہ جن کی تفصیل تذکرہ معیار الشعراء ہنود میں کہ جہاں

فارسی کلام ان کا درج ہوا ہے، قلم بند ہو چکی ہے، ۱۷ برس کی عمر سے

۳۷ برس تک مناصب داروعلی و منشی گیری وغیرہ سرکار انگریزی پر

ماسور رہ کر اب پینشن دار ہیں اور لڑکے نوکر چاکر۔ سوائے علم ہی فارسی

عربی اور کچھ سنسکرت کے جملہ فن شاعری اور علم الہی و تاریخ و جغرافیہ و

نجوم و منطق و مذاہب سے خیلے واقف ہیں و مذہب خدا پرستی

موجود اند رکھتے ہیں اور ذوق، نوامین، غالب، تقیہ اور شیفہ وغیرہ

شعراء نامی کے ہم عصر اور ہم مشاعرہ ہیں۔ راقم تذکرہ سے بھی

خط و کتابت ہے اور منہ راجہ ذیل کلام خود ان کا اسس تذکرے

کے لیے بھیجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ ہمارے قوم میں غنیمت ہیں

”حضرت اساذھی مولانا اسد اللہ خاں صاحب غائب کی مدح میں ہے۔ مطلع ہے سہ
چشم بد دود ہے تو دیدہ گریاں میرا چادر آب کا آک پاٹ ہے داماں ٹٹرا
مدح کے اشعار ہیں :

جس کا غائب ہے تخلص اسد اللہ ہے نام
پر ہے ہادی مرزا ممبر مرزا استاد مرا
نجلو گویا ہے حدیث اس کا بخار دود ہے کلام
انور جی ہے وہی اور وہ ہی مرا احسان قافی
غبار آب اس کا ہے گھر کو چہ ہے اس کا سماج
در عرفی و معانی پہ جیسے سانبہیں میں
یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا
قبلہ ہے کعبہ ہے توں میرا ہے ایساں میرا
فارسی اس کا وہ دیوان ہے قرآن میرا
آگرہ تہ ہے اور دلی ہے شرواں میرا
ہے ظہیر اپنا وہی اور وہی سلساں میرا
کعبہ شیراز ہے اے قبلہ صفا ہاں میرا

نام پر کالہ آتش ہے قصیدے کا مرے

کہ وہ ہے صبر ہے سوز دل سوزاں ٹٹرا

ایک موقع پر بڑے فخر سے کہتے ہیں سہ

شاعروں پر کیوں نہ غائب آؤں اے بے صبر میں

حضرت غائب ہیں آخر کو مرے استاد بھی

اس کلیات کا ۲۲ واں قصیدہ بھی ”سہی“ دود دل“ غائب کی مدح میں ہے اور

اس طرح شروع ہوتا ہے :

یکنائی جس طرح سے ہے جاناں کو جاں کے ساتھ

ہے یک دلی سخن کو ہماری زباں کے ساتھ

بھر رواں سے موج کو ہے جس طرح سے ربط

بھر سخن کو ربط ہے طبع رواں کے ساتھ

مانندہ لفظ و معنی و مانند جسم و جہاں

مثلی صفات و ذات نہاں ہے عیاں کے ساتھ

جب تک پھرے گا چرخ، پھریں گے میرے دن
گردش مرے نصیب کو ہے آسماں کے ساتھ

اس کے بعد لکھتے ہیں یہ
سودا و تیر و مصحفی و جرات اور درد

مجھ کو نہیں ہے کام کچھ ان رفتگاں کے ساتھ
ممنون و مومن، آتش و ناسخ، نصیر و ذوق

کچھ واسطہ نہیں ہے ان اہل زباں کے ساتھ
جو مہر سے ہے ذرے کو نسبت، وہی مجھے

نسبت ہے میرزا اسد اللہ حناں کے ساتھ
غالب ہے غالب اشعر، اکامرے لقب

رشتہ ملائذہ کا ہے اس نکتہ داں کے ساتھ
اس شاہِ مُلکِ منظم سے ہے مجھ کو مشورہ

مثل بزرگمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ
نام آوری وہ کیا ہے جو ہو مدح شاہ سے

شہرتِ ظہیر کو تھی قزل ارسلان کے ساتھ
معنی نے اس کے شعر اڑائے جہان میں

عقبا یہ وہ ہے اُرتا ہے جو آشاں کے ساتھ
دعویِٰ برابر ہی کا ہے اس کو کمال سے

دلی کو ہم سری کا ہے سراصفہاں کے ساتھ
لطف ان کا کون اٹھائے بغیر از لطیف طبع

لاکھوں لطیفے اس کے ہیں لطفِ زباں کے ساتھ
باد صفت کثرت اس کا سخن بھی گراں بہا

ارزاں یہ جنس بجکتی ہے نربخ گراں کے ساتھ

ہنگام ذکر خستہ دنداں مناسے دوست
 ہے گل فشانی بھی سخن درفشوں کے ساتھ
 بخت اس کا ہے جوان و خرد اس کی پیر ہے
 پیروں کے ساتھ پیرو جواں ہے جواں کے ساتھ
 جام و صراحی و نئے و جنگ اس کے (پاس) میں
 مسرور ہے سدا انھیں خورد و کلاں کے ساتھ
 ایراں کو عہد غالب عالی جناب میں
 تباہ مقاومت نہیں ہندوستان کے ساتھ
 ”وہ دل“ اس قصیدہ کا بے قصبر نام ہے
 سوزِ دروں ہوں جھکوسے نسبت و خاں کے ساتھ
 قصیدہ اعجاز سخن میں غائب کی پیروی پر فخر کیا ہے
 خوب کی پیروی حضرت غائب شاہنشاہ
 کہ وہ ملت میں مصدی کے لیے بچھلا حاصل (کا)
 نام بے قصبر قصیدے کا ہے ”اعجاز سخن“
 اس کا ہر عقدہ مضمون ہے بالائے خورشید
 اور بعض قصیدے غائب کی زمینوں میں لکھے ہیں، کلیاتِ نظم غائب میں غائب کا
 مشہور قصیدہ ہے
 خیر: تابنگری بہ شاخ نہال طوطیان زمرہ میں تمثال ہے
 بے قصبر نے اسی زمین میں ایک قصیدہ عید کی تہنیت میں ”دل فریب“ کے
 عنوان سے لکھا ہے۔ ملاحظہ ہے :

۱۔ کلیاتِ بے قصبر قلمی ورق ۱۴۳ ب ۲۔ ایضاً ورق ۱۶۰ ب
 ۳۔ کلیاتِ نظم غائب : فول کنور ۱۹۵۲ء ص ۲۶۹۔ کلیاتِ بے قصبر تذکرہ میں غائب کا یہ شعر
 اس طرح درج ہے :

خیر: تابنگری بہ شاخ نہال طوطیان زمرہ میں پروبال

نسبت ابرو سے یار سے ہے کمال عید کا چاند کیوں نہ ہو سے بلالؑ
 اسی طرح بعض غزلیں بھی غالب کی زمینوں میں کہی ہیں۔ غالب کی مشہور غزل ہے
 نمایاں مجھ سے، بیاباں مجھ سے۔ اس میں بے قصبر نے غالب کے مصرع پر گزیر لگائی ہے :
 شب تہائی میں بے قصبر : قول غالب سایہ خورشید قیامت میں ہے پہاں مجھ سے
 غالب کی غزل ہے "ویدار ہے، سرشار ہے" اس کا ایک شعر بے قصبر نے
 اپنی غزل کے حاشیے پر لکھا ہے :

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
 ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناحپا کھے
 اس زمین میں بے قصبر نے کیا اچھا شعر کہا ہے ۔

ہر طرف سے اب تو ہے عاشق کے اوپر وار ہے
 تیرے تیرے تیرے اور تلوار پر تلوار ہے
 کلیات بے قصبر میں کتابت کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ اس میں غالب کا ایک
 مطلع اس طرح درج ہے ۔

گر شنگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو دی نوید کہ مرنے کی آس ہے
 دیوان غالب کے نسخہ آخری میں یہ شعر دوں مندرج ہے :

گر شنگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہے
 اس زمین میں بے قصبر کی غزل کا مطلع ہے ۔

پاس آئیے در اند مقام ہر اس ہے خدمت میں آپ کی مجھے کچھ الٹا س ہے
 بے قصبر نے "بے قراری ہے، اکاری ہے" اس زمین میں بھی غالب کی
 پیروی میں غزل کہی ہے ۔

۱۵۵ اب ۱۵۴ ایضاً ورق ۱۰۲ ۱۵۳

۱۵۴ ایضاً ورق ۹۰ ب۔ ۱۵۵ دیوان غالب نسخہ آخری ص ۲۱۲۔ ۱۵۶ کلیات بے قصبر قلمی ورق ۹۰ ب

۱۵۷ نسخہ آخری ص ۲۰۳ ۱۵۸ کلیات بے قصبر قلمی ورق ۹۰ ۱۵۹

بے قراری سی بے قراری ہے کہ زمیں زلزلہ میں ساری ہے
 وجہ آنکھوں سے میری جاری ہے کوئی طوفاں ہے یا کہ مازی ہے
 بے صبر نے غائب کی اس غزل میں بھی شعر کہے ہیں سے
 رفتارِ عمر قطع رہا اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہے
 بے صبر کا مطلع ملاحظہ ہو سے
 جو تجھ بغیر، مشیت و جامِ شراب ہے اپنا دل پر آتش و چشم پر آب ہے
 غائب کا مطلع ہے سے

دلِ نازک پر اس کے حجم آتا ہے مجھے غائب
 نہ کر سرگرم اُس کا فر کو الفت آزمائے میں
 بے صبر نے اس روایتِ قافیہ میں بھی غزل کہی ہے۔ یہاں صرف مطلع درج
 کیا جاتا ہے سے

ہم ناصح ہے بند اک شور و حشت ہے زمانے میں
 سُنے ہے کون طوطی کی صدا نعتِ ارفانے میں
 غائب کی شہرہ آفاق غزل ہے ”دنیا مرے آگے، تماشا مرے آگے“ اس
 کا ایک شعر بے صبر نے حاشیے پر اس طرح درج کیا ہے :
 گو ہاتھ میں طاقت نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
 رہنے دو ابھی سا غر و مینا مرے آگے
 مولانا عرشی نے پہلا مصرع اس طرح تحریر فرمایا ہے :
 ”گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے“
 بے صبر کا مطلع ہے سے

۱۔ کلیاتِ بے صبر مذکورہ ورق ۲۹ ب

۲۔ ایضاً ورق ۲۸ ب

۳۔ ایضاً ورق ۲۷ ب

جب منہ سے نقاب اس نے اٹھایا مرے آگے
ایک نور کا عالم نظر آیا مرے آگے
بے تبصر نے جرات کی تقلید میں بھی شعر کہے ہیں
کچھ بن آتی نہیں بے تبصرہ قول جرات
قیہ عصمت میں سے وہ جس کے گرفتار ہیں ہم
جرات کی غزل پر ایک مدح کہا ہے

مدت سے شب وصل کے ہونے کی خبر تھی
ہر شام سے تاصبح نظر جانب در تھی
سو آج وہ شب رشک شب قدر مگر تھی
لیکن نہیں معلوم گھر ہی تھی کہ پہل تھی
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی
نیک زلف سے سچ پر جو نظر کی تو محبت تھی
بے تبصر نے غالب کے انتقال کی تاریخیں بھی کہی ہیں

ہماں میرزا غالب استاد من
بجاں آفریں جاں چو آئینہ پرو
ہر پریدم از دل سن رحلتش
بنالید و گفت آہ غالب برو

۱۲۸۵ھ

اردو کا قطب ہے

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ
جب سدھائے بسوے غلہ ہوئے
جس سے اہل کلام تھے مغلوب
سخن ان کے الم میں سینہ کو ب

اس پہر سخن کے اختصار کا مجھ کو سالِ غروب تھا مطلوب
 کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت ہوا جیت آفتابِ بندِ غروب
 بے صبر کو یہ "دیوان" بہت عزیز تھا؛

شعر سخن کر جس کو دیوان کہا کرتے تھے آپ
 اب وہی بے صبر دیکھو صاحبِ دیوان ہوا
 اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا غالب نے اس دیوان کی (جس کو کلیات کہنا
 زیادہ صحیح ہے) اصلاح دی تھی۔

جب حضرت غالب نے دی اصلاح اس دیوان کو
 بے صبر کامل ہو گیا اور مستبر میرا سخن

بے صبر نے اس اصلاح کی تاریخ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) درج کی ہے۔
 مخطوطہ کلیات بے صبر کا یہ تعارف ناقام رہے گا اگر اس کے پہلے تصدیق
 "نوبہار" کا ذکر نہ کیا جائے جو ہندوستان کی تعریف میں ہے اور جس کو میرے
 خیال میں اردو کی وطنی شاعری میں اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے
 کہ اس میں وطن کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ شعر اسے ماقبل سے مختلف اور نیا
 ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ "دیوان" ۱۸۵۷ء میں اصلاح پا کر مرتب ہو گیا تھا۔
 ورق ۱۲۷ الف ۱

خطِ دل نشیں ہے ہندوستان خاکِ روئے زمیں ہے ہندوستان
 دل نشیں کیوں سواد ہے اس کا گر سو یہ انہیں ہے ہندوستان
 دو طرف بھر و یک طرف ہے سندھ یک طرف تا پچیس ہے ہندوستان
 مرد و زن یہاں کے حور و غلمان ہیں رشکِ حسلہ بریں ہے ہندوستان
 یہاں کے عارف جہاں میں ہیں معروفت مجمعِ العارفین ہے ہندوستان
 ورق ۱۳۸ الف ۱

پہلوں و حکیم و عارف سے کبھی خالی نہیں ہے ہندوستان

کہ بہت اولیں ہے ہندوستان
 دو جہاں آفریں ہے ہندوستان
 ترنگل و یاسمین ہے ہندوستان
 کہ عجب محل زمیں ہے ہندوستان
 خط روے حیں ہے ہندوستان

شاہر ناز میں ہے ہندوستان
 دامن و استیں ہے ہندوستان
 کہ ازل سے گزیر ہے ہندوستان

کہ سبک آگیں ہے ہندوستان
 کیونکہ اس کی زمیں ہے ہندوستان

ہے توار پتج ہند سے ظاہر
 یہیں برتہا تھا حبہ ہر دو جہاں
 جہاں دیکھو وہاں ہے باغ و بہار
 کہتے ہیں گل زمین کے سیاح
 مردم چشمِ حُسن ہیں ہندی
 ورق ۱۳۸ ب :

ناز اس کا نہ کیوں نیاز آٹھائے
 پائے تمکین کو دستِ بخشش کو
 حق ابد تک رکھے اسے آباد
 ورق ۱۳۹ الف :

حق اسے سنگِ تفرقہ سے بچائے
 نو بہار اس قصیدہ کا ہے نام

غالب اور آزدہ

مفتی صدر الدین خاں آزدہ دہلوی کا پایہ علم و فضل اور شجاعت و شرافت میں بہت بلند ہے۔ وہ مولانا فضل امام خیر آبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے اور دہلوی فضل حق کے ہم سبق۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک فارسی خط میں جو انھوں نے کلکتے کے مولانا امین اللہ کے نام لکھا تھا، ان کا شمار دہلی کے "فضلائے نامدار" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فنون عقلی و نقلی اور ادب و اصول میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

تذکرہ کریم الدین، میں لکھا ہے :

"آزدہ..... گنجینہ علم و کانِ حلم و بحرِ سخا، مخزنِ لطف و جود و عطا، بیدہ دوراں، حساں ہندوستان، عالمِ کامل، فاضلِ اجل، فقیرِ بے مثل، عالمِ باعلیٰ، مدح میں ان کی جو کھوں سو کم ہے، کیوں کہ وہ ایسا ہی عالم ہے..... ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرہ شعرائے آزدہ میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام لکھیں مگر امتیاز میں جانتا ہوں کہ بدوں نام نامی ان کے کی یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسند احباب

نہ ہوگی کیوں کہ اس زمانہ کے شعراء اردو گوئیوں میں مثل شاہنشاہ کے ہیں۔
مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے لکھا ہے :

” (آزردہ) ایسے مستقیم اوصاف حمیدہ اور خصائل برگزیدہ کے تھے کہ آج
کا نام نیک اور شہرہ و معدلت ضرب المثل ہے..... بے شائبہ تکلف و
بے آمیزش ایسا فاضل اور ایسا کامل سوائے سرگردہ علماء کے بسا
عالم پر جلوہ گرد تھا۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ آزادہ کے دیوان خانے میں اہل علم کا مجمع رہتا
تھا اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔ ان کا مذاق سخن بہت پاک تھا۔ انہیں
ہے کہ ان کا نہ تو دیوان ملتا ہے اور نہ تذکرہ شعرائے ریختہ۔ لیکن حالی نے جو اقوال ان سے
منسوب کیے ہیں ان سے ان کی نکتہ بنی اور سخن بھی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

یہ اشعار ایک اعلیٰ درجے کا شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔
میں اور ذوقِ بادہ نشی نے گیس بجے یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

کامل اس فرقہ زدہ میں اُنھما نہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی زندانِ قدحِ خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلفِ سیاہ خام یہ کافر کیا خاک جے کوئی، شب ایسی، سحر ایسی

اے دل تمام نفع ہے سوئے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سوا یا زیاں نہیں
ملنا ترا یہ غمیر سے ہو بہر مصلحت ہم کو تو سادگی سے تری یہ گمان نہیں
اجھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ اک تہمتی، بلا تھی قیامت تھی جہاں نہیں
کشتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق شاید کہ گردش آج تجھے آسمان نہیں

۱۔ تذکرہ کریم الدین، ص ۱۳۱، اس کے علاوہ ملاحظہ ہو سخنِ شعرا (نوکلشور) از آغا، ص ۲۲۔

۲۔ واقعات دارالحکومت دہلی، ج ۲، ص ۱۳۰ (مجلسِ شہین پریس، لاہور)۔

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند
کس دن گھلا ہوا ویرِ پیہرِ مغاں نہیں
آزردہ نے پڑھی غزل اک مے کدے میں کل
وہ صاف ترکہ سینہٴ پیہرِ مغاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے ہاں دستِ جنوں
کیوں ہے بیکا گر بیاں تو مرادور نہیں

گھر سے گھبرا کے، کھلے باؤں، ہر اک کھٹکے پر
کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو قیاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگی اہلِ حشر
کہیں پریشِ داو خواہاں نہیں

غالب نے اس قطعہ میں ان کی سخن وری کا اعتراف کیا ہے۔
ہند را خوشش نفسا نہ سخن در کہ بود
باد و غلوط شاں مشک قشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و سلمی و انکھاء
حسرتی اشرف و آزدہ بود اعظم شاں
غالب نے شیفۃ کو ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں
رنجِ راہ کی تلافی، مخدومِ معظم و صدرِ اعظم مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر کے دیدار سے
جو گئی بلع شیفۃ ہی کو ایک اور مشاعرے کا حال لکھتے ہیں کہ حضرت آزدہ اگرچہ دیر میں
آئے لیکن انھوں نے آکر دل کو صفا اور زبان کو نوا بخش اور میں نے گریستن کی زمین
میں اپنا قارسی قصیدہ پڑھا۔ حافی کا بیان ہے کہ یہ قصیدہ بہت کامیاب رہا۔
شیفۃ نے گلشنِ بے خار کے سوسے میں آزدہ کا ترجمہ شامل نہیں کیا تھا اس
کو دیکھ کر غالب نے شیفۃ کو لکھا ہے :

”گہر نہ مفتون خامہ دروہ بیتِ اہت، بنگارش اشعار پر دیں شعور
حضرت آزدہ ازچہ است، ہرچہ ذکرِ خدام بر جیس مقام در جریدہ ایں
فن نہ سرا دارِ شان فضیلت باشد، لیکن اگر بہ مقتضائے سربطِ محبت

جراتے بکار می رفت گنا ہے نبود، و در تلافی آں بہ پوزش نیاز نمی افتاد
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتہ نے آزدہ کا حال بڑھا کر یہ کی پوری کر دی۔ اس
کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

”دعویٰ اور اک غلش از جہل خیاط ازل بایں خوبی قبائے قابلیت
بر بالائے ندرختہ و روشن گرفتار بایں روشن ولی و آگاہی آئینہ ضمیرے
نیفر وختہ، بایں فضیلت شاعری از ایران سرکشیدہ و بایں غفلت ساحری
از بابل نرسیدہ، با خیال شرح کمالاتش طوطی خامہ من بایں قدرت گفتار
نغمہ سنج بے زبانی است۔“

غائب نے آزدہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جو کلیات فارسی میں موجود

ہے۔ چند اشعار یہ ہیں :

ناں نمی ترسم کہ گرد و تعبر و دوزخ جہائے من واسے گر باشد جہیں امر و من فروائے من
صدر دین و دولت و صدر المصدا و روزگار میر و محمد دم و مطاع و والی و مولائے من
گویم و از نکتہ چینان و در دلم بود ہر اس کیقباو و قیصر و کبیر و دورائے من
موکبش چوں مزج عام ست با غیر مچ بحث پرشے دار و اسطو مید و وہبائے من
عاجزم چوں در شنائے و دست بار شکم چہ کار میروم از خویش تا گیر و عطا دجائے من
خاک کویش خود پسند افتاد و در جذب بحد

سجدہ از بہر حرم نگداشت در سبائے من

غدر کے الزام میں مولوی فضل حق انڈمان بھیجے گئے۔ شیفتہ کو سات برس کی قید
ہوئی۔ آزدہ کو بھی قید و بند کے مصائب جھیٹنا پڑے۔ غائب نے ۱۰۶۲ء کے ایک
خط میں لکھا ہے :

لہ کلیات غائب، پنج آہنگ، طبع ۱۰۶۵ء، خط نام شیفتہ

۱۱۔ تذکرہ گلشن ہے غار (شیفتہ) نئی کشور، ص ۱۱

۱۲۔ کلیات فارسی ص ۲۰۰ تا ص ۲۲۲

حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، رو بکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا، نوکری موقوف، جائداد ضبط، تاجدار خستہ و تباہ حال لاہور گئے، فنانشل کسٹنڈر اور فنانٹ گورنر نے ازراہ ترجم نصف جائداد و اگلاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ اداوان کے گزاردے کو کافی ہے، اس واسطے کہ ایک آپ ادا ایک بی بی، تیس چالیس روپے جینے کی آمدنی، لیکن امام بخش کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، فراغ مالی سے نہیں گزرتی، خضعت پیری نے بہت گھیر لیا ہے، عشرہ ثانیہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔

بھڑوچ کو لکھتے ہیں :

”دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا... اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، ملی ماہوں میں سگب دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود و مظلوم و محروم و خنوم۔“ خطوط غالب، ص ۲۵۸۔

آزادہ کا انتقال ۲۳ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ بمطابق ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو ہوا۔

شمس الشعرا مولوی ظہور علی نے تارخ وفات لکھی ہے۔

چرمولاناے صدر الدین درمصر	امام عظیم آخر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر	بعدل و داد چوں نوشیر داں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت	کہ ایں عالم نہ چلے جاو داں بود
ربیع الاول و بست و جہاد	دوارع و دوسوے دارالبحاں بود

چراغ عشق بست تارخ ولادت

کنڈ غنیمت چراغ دو جہاں بود

(۲۱)

آزادہ نے انتقال سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ایک خط لکھا ہے جو نہایت اہم اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس لیے ہم اسے تمام وکمال نقل کرتے ہیں۔ جناب مستطاب نواب صاحب علی القاب جم المناصب کثیر المناقب معدن تفقد و نوازش بے پایاں، استغفار نیاز منداں، ملاذ عقیدت کیشاں وامت عند شکم۔

شکر الطمان والا میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے۔ اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہ والا جہاد سے دین اور دنیا میں مارج علیا عطا فرمائے۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تب اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت لیسق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے، ان دونوں کو آپ کی پیروی کے جاتا ہوں، اگر ناگوار خاطر خاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہو گا۔

پسروم بتو مایہ خویش را

تو دانی حساب بکم ویش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے۔ ذوالجلال والا کرام آپ کو عمر خصصری اور وانش فلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرمائے۔

لے گا ڈوب گیم نام تھا۔ رام پور میں نواب صاحب کے نام کا ڈوب گیم کی عرض بھی فارسی میں ہے جس میں انھوں نے آزادہ کے کتب خانے کی فہرست بھی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو غور کے بعد فراموش کیا ہے۔

معروضہ پانزدہم جولائی ۱۹۶۶ء مطابق بہت دسوم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ
 نیازنامہ محمد صدر الدین خاں صدر المصروف سابق دہلی

پتہ پر لکھا ہے :

بسیار ضرورت زد و ترو برد
 مہر محمد صدر الدین خاں

طرقہ لطیف ہے کہ غالب نے آزرہ کے انتقال کے بعد جن سے زندگی بھران کے ہنس
 اچھے مراسم رہے اور جن کو انھوں نے میر و مخدوم و مطاع اور والی و مولا سب ہی کچھ کہا تھا، نواب
 کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ہے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی
 کوشش کی ہے اور ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کر کے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ غالب
 کی سیرت کا یہ پہلو قابل اعتراض ہی نہیں انگیز بھی ہے ہم وہ غیر مظلوم خط، بجنہ
 نقل کرتے ہیں :

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے
 مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجویز و تکفین کے
 واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن
 نہ رہے گا جیسا کہ میرزا جلال امیر کہتا ہے :

عج حرمہ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت
 کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا مال
 یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساتھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت
 میں ہیں۔ امین الرحمن اس کا بھانجا ہے، مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہے (اکذا)

۱۔ دارالانشاسکا دو ہتھوار رام پور، شعل نمبر ۲۵۶، صیغہ دوست آفتابیان اس کے بعد دوسرے لائنوں پر
 کے مقرر کر دیئے گئے۔
 ۲۔ آزرہ نے احسان الرحمن لکھا ہے۔

آپ سے، ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے، دوسرا اتنا سس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخششِ خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے جینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے عین حیات قرار پائے، یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک دولت دعوہ و جاہ روز افزمنوں
روزِ شنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۲ جولائی سالِ حال، عرضداشت دولتِ خلیفہ امیر اللہ

(نفاذ پر ۲۷ جولائی ۱۳۶۷ء درج ہے)

یہ خط مسکاتیبِ غالب میں نہیں ہے، لیکن اس تاریخ کے بعد کا پہلا خط مندرجہ ذیل ہے۔ دونوں میں تعلق ہے، اس لیے اس کے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں،

تین اتنا سس سابق (میں) پیش ہوئی تھیں، سواب پہلے برخوردارِ نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و قبول ہونے کی نوید پائی۔ انشا اللہ اکرم حسب ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں آمد زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جدا گانہ مقرر ہو جائے گی۔

باکریاں کارہا و شوازیست کیے معروضہ ۱۳ مارچ اگست ۱۳۶۷ء

غالب نے نوابانِ رام پور کو خاصے خوشامانہ خط لکھے ہیں لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا عباد و سبوح و دونوں ہی کے لیے شرمناک ہے اس لیے غالب کا جرم بڑا ضرور ہے لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، انھوں نے انگریز حکام کی تعریف میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی خود نوشت کے یہ الفاظ ان کے نہاں خانہ دل کے بہت سے اسرار

ہمارے اوپر ظاہر کر دیتے ہیں :

”گورنمنٹ میں اس کی (غالب کی) بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے۔ اب کی بار جو لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق کے دربارداروں کی فہرست کے صاحب کشن بہادر حصار نے کہ دریں ولایت تمام صاحب کشن دہلی بھی ہیں، مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا، بے چارہ بسبب بھی دستی اور بے مقدمہ دہی کے لاہور نہ جاسکا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں سے بہا رہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا۔ خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔ اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ مظفر ولایت کو سبیل ڈاک لارڈ آلن ہراگورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۷ء میں مین خط انگریزی بے واسطہ لارڈ گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔

ان امور میں زیادہ سے زیادہ اس زمانے کے مخصوص حالات اور غالب کی نجی وقتوں کی آڑ لی جاسکتی ہے لیکن ان کا جو معاملہ بعض معاصرین اور خاص طور پر آزاد وہ کے ساتھ رہا ہے وہ صریحاً اتنا قابل اعتراض ہے کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز نہ ہونڈھنا مشکل ہے۔ غالب کی غلط صرف ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہے جہاں وہ اپنے طبقے اور سماج کی خرابیوں سے بلند ہو کر اپنی سحر کار آواز سے سب کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

غالب کی شخصیت اور شاعری میں

ترکی، ایرانی عناصر

انیس سو اسی کے متعلق :

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں، بلکہ نوبع انسانی کی تاریخ میں۔ اس سال آدم خاکی
کو وہ عروج حاصل ہوا کہ افلاک اس کی ہمت کے آگے سرنگوں ہو گئے، ستارے کانپ
اٹھے، چاند سہم گیا۔ انسان کے سیفر، جہانِ قمر میں پہنچ گئے اور انسان نے اس
کرہ ارض کو، جس پر ہم رہتے ہیں، پہلی دفعہ زمین سے ہٹ کر بطور اکائی کے دیکھا اور
یہ محسوس کیا کہ ہماری فلاح اور ترقی کا راز صرف یہ ہے کہ ہم اپنے کو
وحدت کا جزو سمجھیں۔ اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں،
نظامِ شمسی کے کروڑوں چھوٹے چھوٹے تیاروں میں سے ایک ہے اور فضا نے بیسٹ
میں اس کی حیثیت ایک ذرے سے زیادہ نہیں۔ یہ علم جو اس کو حاصل ہوا، وہ اس کا

عشر عشر بھی نہیں جو ابھی اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس طرح انسان کو پہلی دفعہ اس کا یقین ہو کہ نوع انسانی کے ارتقا میں انسانی ذہن بھی برابر کا شریک ہے۔ وہ عالم طبعی سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کا باشعور اور غیر مغلوب حصہ ہے اور انسان اپنی بے پناہ ذہنی اخلاقی اور جمالیاتی صلاحیتوں کو ابھار کر اور نئے معانی کی تخلیق کر کے بلند تر اور برتر سعی و عمل کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے فغظوں میں یوں سمجھیے کہ انسان کی ترقی میں سب سے اہم حصہ خود اس کے ذہن اور فکر کا ہے۔ لیکن طوط قمر داغ جگر بھی تو ہے اور اس کا دریاں اگر ہے تو صرف دانشوروں، عادلوں، فنکاروں اور شاعروں کے پاس ہے۔ اس لیے کہ لیکن ناوچی ہزار ترقی کرے، وہ اقتدار کی محرم اور زندگی کے سوز و ساز کی شریک نہیں ہو سکتی۔ وجدان اور فکر کے یہ بھروسے ہماری تہذیب کی ابدی دولت ہیں اور ان کے تسلسل ہی پر ہماری ترقی کا انحصار ہے۔ ان کی تخلیق میں دانشور کی محکم ہمارے شاعر کا ذہن رسا، عارف کا وجدان صمیم اور صوفی کا قلب گما از سب ہی شامل ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعے زندگی کا قافلہ آگے بڑھتا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی ترقی کی بنیاد یہی تہذیب ہی تسلسل ہے جو ترکیب و امتزاج کے ذریعے اور محسوس کی تہذیب کی شکل میں ہم کو عہد بہ عہد اور نسلا بعد نسل ملتا رہتا ہے اور جس کے ذریعے ہم بر نئی نسل کو حسن معنی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس اعتبار سے میں مرزا غالب کی یاد ماننے کو ہوں۔ اس لیے کہ ذہن کی تربیت تہذیبی ورثے سے ہوتی ہے اور ول و داغ کی سیرانی میں ان ادبی کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان تہذیبی دولت سے مالا مال ہے لیکن اس تو بھری میں غالب کی تخلیقات نے مزید اضافہ کیا ہے۔ ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ، حیرت انگیز کارناموں سے مملو ہے۔ اس نے دنیا کی تہذیب کے نقش میں اپنی شوخی تحریر سے رنگ بھرا ہے اور اس کے مرتق کو پہلے سے زیادہ اونچی محراب پر بٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر عہد قدیم کی مقدس کتابیں، جہاں تادہ کی

تعلیمات، اشوک اور اکبر کے کارنامے، کالی داس کی شکستہ، سانچی کے آثار، اجنتا کے نقوش، جنوبی ہند کی بُت تراشی، اڑیسہ کے مندر، آگرہ کا تاج محل، فتحپور سیکری کے محلات، دہلی کی مساجد اور قطب مینار، حضرت نظام الدین ادویا، کبیر اور نانک کا تصوف، آردو کا آغاز اور تقی میر ابائی کے گیت، میر کی غزلیں، مندروں کے رقص، مغلوں کے حکمت آمیز قصے، منصور اور منوہر کی رنگ کاری، بیجو اور تان سین کی نغمہ سرائی، خسرو اور غالب کی شاعری نے فنون لطیفہ کو ان جمالیاتی بلند یوں تک پہنچا دیا ہے جس پر خود تاریخ کو رشک ہے۔ اس فن تعمیر، اس سنگ تراشی، اس مصوری، اس رقص، اس شہوہ بیانی کے پیچھے آخر وہ کون سی مضطرب آرزو ہے جس نے ان فنی تخلیقات کو دوام بخشا ہے، وہ کون سا روشن ذہن کا فرما ہے جو براہِ موت کی حقیقت سے انکار کرتا رہا اور یہی کہتا رہا :

مرگ، اک ماندگی کا دفعہ ہے
یعنی آگے جلیں گے دم لے کر

ہندوستان ایک عظیم الشان تہذیب کا وارث ہے اور اس باغ کی شاوابی اور خوش نمائی اس میں پوشیدہ ہے کہ اس میں صرف ایک رنگ یا ایک قسم کے پھول نہیں ہیں بلکہ بہت سے رنگوں کے اور بہت سی قسموں کے پھول ہیں، اور ان سب کی شاوابی پر ہمارے باغ کی شاوابی اور خوش نمائی کا انحصار ہے۔ تہذیب کا وہ سرچشمہ جو موبہنجا رو سے بھی پہلے چھوٹا تھا، عہدِ قدیم، عہدِ وسطیٰ اور عہدِ جدید کے میدانوں سے گزرتا ہوا جو ہم تک پہنچا ہے اور ان مختلف تہذیبی نہروں نے ہمارے باغ کو اتنا سرسبز و شاداب بنا دیا ہے کہ باوجود ہزاروں ماہ و سال گزرنے کے اس پر کسی قسم کی گملاہٹ کا اثر نہیں۔ یہاں مختلف قومیں اور تہذیبیں آئیں۔ ان میں آویریش بھی ہوئی اور آریویش بھی۔ لیکن ان مہجوں نے اس تہذیب کی مٹی کو پہلے سے زیادہ زرخیز بنا دیا اور اس تمدن میں وہ رنگا رنگی، وہ خوب صورتی، وہ گہرائی، وہ گیرائی پیدا کر دی جو حاد راہی نہیں، نوع انسانی کا تیش قیمت دینا ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں جو دنیاوی عنصر کارفرما ہے، وہ کثرت میں وحدت اور منظر ہر کی رنگارنگی میں، اصل حقیقت اور ماہیت کی جستجو ہے۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ نقاشی کے ذریعے مجھے عرفان الہی کی ایک مخصوص انداز میں آگہی حاصل ہوتی ہے۔ غالب نے تجوروں میں قصے بتانے کی آرزوی کا نظارہ کیا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی انہی دنیاوی تصورات اور اسی جمالیاتی شعور کی کار فرمائی ہے۔ غالب کی شخصیت کا تار و پود ترکی، ایرانی اور ہندی عناصر سے مل کر بنا ہے اور ان کے ذہن کے تمام نقش و نگار ان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ ان کی طبیعت اور مناسبات ماحول اور تمدن اور تہذیبی ورثے نے مل کر ترتیب دیے ہیں۔ یہی وہ تشکیلی اثرات ہیں جنہوں نے ان کی جمالیاتی اقدار کی صورت گری کی ہے اور جو میرے اس کچھ کا موضوع ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم غالب کے افکار کی نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تہذیبی عوامل کی نشاندہی کرنا ہوگی جو صدیوں اور نسلوں سے گزر کر اور چین کز ان کی شخصیت اور شاعری میں نشین ہو گئے تھے جنہوں نے ان کو قدروں اور معیاروں کا ایک ہم آہنگ تصور بخشا اور جن کی بدولت ان کی شخصیت میں دلکشی اور شاعری میں توانائی اور تازگی پیدا ہو گئی۔

ہمیں یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ انسان، فطرت سے ہم آہنگی یا شکست کے ذریعے جو تجربات حاصل کرتا ہے، تہذیب اسی کی مرتب شکل ہے۔ ماز فطرت کی تلاش و جستجو اور فطرت کے خلاف جدوجہد تہذیب کے سفر کا زار و راہ ہیں۔ کسی خاص تہذیب کے انداز کا انحصار انسان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ اس کے ماحول کی نوعیت اور ان کے باہمی عمل اور رد عمل پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح سوچے تو معلوم ہوگا کہ غالب کی شخصیت اور شاعری کو ہندو، ایرانی، ترکی تاریخ کے پس منظر ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے اجتماعی ورثے، ان کے ملکی ماحول اور ان کی شخصیت افتادہ مزاج نے باہم مل کر بھی ان کے ذہن کے نقش و نگار ترتیب دیے ہیں۔

غالب کے اجداد وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں آریائی تہذیب کی پہلی کرن چھوٹی۔ اس جغرافیائی علاقے کی حد ہندی قدرت نے کچھ اس طرح کی

ہے کہ ایک طرف کوستان اصفائی ہے، دوسری طرف بحر کاسپین۔ نیچے پامیر اور رقرقرم کے پہاڑ۔ مشرق میں گوبی کارگیستان اور مغرب میں آمو سرود یا اور ذرافشاں کے چھوٹے چھوٹے نخلستان یہی دو خطے ہیں جو تہذیب کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ یہ علاقہ ایک زمانے میں جھیلوں اور آبشاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن آب و ہوا کی تبدیلی سے خشک ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ سیکڑوں بستیاں ریت میں دھنس گئیں۔ پارسش کی قلت اور فقدان راحت سے مجبور ہو کر ترکستان کے رہنے والے ہجرت پر مجبور ہوئے اور یہ سلسلہ غالب کے انتقال سے ایک سال پہلے تک اسی شدت سے جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۶۱۸۸۸ میں ۸۰۰۰۰ ترک، غالب کی زبان میں عالم ارواح کے گنہگار اپنی بے آب و گیاہ زمین چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان کو شاداب علاقوں میں آکر پناہ لینا پڑی۔ اسی طرح بالکل دوسرے اسباب کی بنا پر ۶۱۹۵۰ میں دوسرا ترک، لداخ کے راستے سے سری نگر میں آکر پناہ گزین ہوئے اور آج بھی ان کے قبائل صفا کہل میں مقیم ہیں۔ ترک باؤں توڑ کے نہیں بیٹھتے۔ غالب بھی کبھی مائع دشت نور دی نہیں رہے اور ان کی آوارگی سے آشنائی اور عافیت سے دشمنی، قدیمی اور اذنی ہے۔ کھلنے کا سفر بھی قطعی سلسلہ شوق نہیں تھا، فرماتے ہیں :

اگر بہ دل نہ خسلد بر صہ از نظر گذرد

زہے روانی عمرے کہ در سمنہ گذرد

مرزا غالب کے اصل و گویہ کا حال جیسا کہ انھوں نے مہر نیرور کے دیباچے میں لکھا ہے۔ یہ ہے کہ ان کے بزرگ سمرقند میں آکر بس گئے تھے اور وہاں سے جس طرح سیلاب بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے، ہندوستان کی طرف منتقل ہوئے :

”از داپسیان این قافلہ نیامے من کہ در خطرو ماہ راء النہر سمرقند شہر مسقط الراس

وے بود چون سیل کہ از بالا بہ پستی آید۔ از سمرقند بہ ہند آمد۔“

اس علاقے کو بہت سے مورخین نے ایک بڑے حوض سے تشبیہ دی ہے جب اس میں پانی بھر جاتا ہے تو وہ ہندوستان کی طرف بہہ نکلتا ہے۔ غالب نے اس واقعے کو

اس طرح بیان کیا ہے : چون سِل کہ از بالا پستی آید از سمرقند پہنہ آمد۔ درفش کاویانی
میں زیادہ وضاحت سے لکھا ہے :

" پانچویں سلجوقیان بعد زوال و برہم خوردن ہنگامہ سلطنت وراقلم و سبع الغضائے
ماوراء النہر و مراگندہ شغندہ اذان جملہ سلطان زادہ ترسم خان کہ ما از تخسب اویم
سمرقند را بہر اقامت گزیدہ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیاسے من از سمرقند
پہنہ وستان آمد :

غالب نے اپنے فارسی اشعار میں بھی اس علم سے خاندان پر فخر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

غالب از خاک پاک تور انیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
ایکیم از جماعت اتراک در تمامی زمانہ وہ چسندیم
فن آباے آشاورزی ست مرزباں زادہ سمرقندیم

یہ سمرقند کا علاقہ تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے لیکن اس نے چین، قبا اور
طرف کلاہ کے بھی بہت سے مناظر دیکھے ہیں۔ سکندر اعظم ایک ہاتھ میں تلوار اور
دوسرے میں ہومر کی ایڈ (ILIAD) لیے ہوئے آیا اور اس نے اس علاقے
علاقے کو زبرد زبرد کر دیا۔ فلسفیوں نے انسانی بڑیوں کا سفوف ہاتھ میں لے لے کر
بہت پوچھا کہ اس میں بادشاہ اور غلام کی تفریق کس طرح کی جائے لیکن سکندر
نے انتقام کے جوش میں لاشوں کے پل بنا دیئے اور ایرانی تہذیب کے نادر و نگار
ایوانوں میں آگ لگا دی۔ اسی طرح تاتاریوں کا سیلاب آٹھا جس نے اپنی ہلاکت آفریں
گرفت میں روس اور ہنگری تک سب کو لے لیا۔ اور ایسی وسیع و عریض حکومت
قائم کی جو چین کے ساحل سے لے کر ڈینیوب (DANUBE) اور نیچے پنجاب تک
پھیلی ہوئی تھی۔ اس سمرقند نے تیمور کی جہاں کشائی اور جہاں بانی کے غوناگوں
مناظر دیکھے جس میں سفاکی بھی شامل تھی، ادب فواری بھی، معارف پروری بھی۔
چنگیز خاں کے پورے سو سال کے بعد سمرقند جاگا تھا اور اس طرح کہ وہ سانس
ادب، فن تعمیر اور مصوری کا عالمی مرکز بن گیا تھا لیکن اب وسط ایشیا میں ایرانی

تہذیب کے نمائندے، عجم زدہ عرب نہیں تھے، بلکہ ترک تھے اور ترکوں سے مسیری مراد،
 تورانی نسل کے وہ تمام لوگ ہیں جو وسط ایشیا اور چینی ترکستان میں بس گئے تھے اور
 ایران کو اپنا تہذیبی سرچشمہ سمجھتے تھے۔

وسط ایشیا سے بہت سی قومیں موج در موج ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ اسی
 طرح مسلمان ترک ہندوستان میں آئے، لیکن وہ حجاز کے عربوں اور اصفہان و شیراز
 کے ایرانیوں سے یکسر مختلف تھے۔ خلافتِ کبرور اور بے دست و پا ہو گئی تھی اور
 اس کے ویرانہ پر خود مختار ترک ایرانی (TURKO-PERSIAN) حکومتوں کے محل تعمیر
 ہو گئے تھے مسلسل فتھیائیوں نے مذہبی جذبے کو سرد کر دیا تھا اور اب یہ ترک ہر عام
 کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ بات شرع کے مطابق ہے یا نہیں۔ جو بات حکومت
 کے لیے مفید ہے ہم اس کا حکم صادر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ
 تمام صوفیہ، اہل تعلیم، اہل ظاہر اور اہل اختیار سے نبرد آزما تھے۔ ان کے نزدیک
 اقدار میں سب سے اہم قدم بخت تھی جس سے دل کی دستوں میں اضافہ ہوتا ہے،
 جذبات کی تہذیب ہوتی ہے، فرد کی اہمیت بڑھتی ہے، رواداری اور مساوات اور
 جمہوریت کی جڑیں سیراب ہوتی ہیں۔ دارا شکوہ کی مجمع البحرین، شاہ غلگیں کے
 خطوط، غالب کے اشعار اور شوقِ فیض کے مطالب سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس
 وقت ویدانت اور اسلامی تصوف ہم آغوش ہو گئے تھے۔ ملتیں اہم نہیں رہی
 تھیں بلکہ ان کے نینے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم تھا۔

ہندوستان میں ۱۲۰۶ء میں جو حکومت قائم ہوئی وہ مزاج اور کیفیت کے
 اعتبار سے ترکی ایرانی تھی یعنی اس کے آمیزہ میں ایران کا احساس جمال اور
 حسن تناسب اور ترکستان کی وسیع المشرقی اور سخت کوشی دونوں شامل تھیں جو
 ہندوستان کی آریائی فضا میں اُن مل بے جوڑ نہیں تھی بلکہ اُس نے اس کے حسن
 کو نکھار دیا اور خود ایرانی تہذیب کے جسدِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا۔ لیکن
 ترکی ایرانی تہذیب کا احیاء دراصل مغلوں کے ذریعے ہوا، جب بابر نے اپنے

وطن فرغانہ کو چھوڑ کر مشاء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں قائم کی۔

غالب کا تعلق مغلوں سے براہ راست تھا وہ نسباً اور اصلاً اس قوم کے فرو تھے جس کا ایک قبیلہ دہلی کے تخت پر حکمران تھا۔ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ ہے کہ باپ کے متروکے میں سے بیٹے کو تلوار سے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ غالب کو ورثے میں یہ ترک ایرانی ذہن تو ملا لیکن اپنے آباء کی تلوار نہ مل سکی۔ البتہ بزرگوں کو یہ تیر ٹوٹ کر ان کا قلم بن گیا۔ شد تیر شکستہ، نیا گھاں قلم، شاعری کے میدان میں البتہ اس کی حیثیت پیر پنکشن کی ہو گئی ہے۔

یہ قبیلے جب ہندوستان آئے تو ان کی پشت پر صدیوں کی وراثت تھی۔ ان کے ساتھ ایک اجتماعی ذہن تھا جس کے سارے نقش و نگار اسی ترک ایرانی ماحول میں صورت پذیر ہوئے تھے۔ وہی علوے نسب کا احساس، وہی اسلام کے کارناموں پر فخر۔ غالب ایک قطعہ میں لکھتے ہیں :

ساقی چو من پشنگی و افرا سیاریم
دانی کہ اصل گوہرم از دودہٴ جمست
میراث جم کہ سے بود اکنوں بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدمست

غالب کے یہاں جو جیندہ و سرسبزچ و مالائے مروارید یاد بار و لبر پر اتنا اصرار ہے، اس کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ ان قبیلوں میں عصبیت بھی بلا کی تھی۔ غالب کا تعلق ایک ترکوں میں قبیلہ برلاس سے تھا اور مجھے ماضقندہ اور سمرقند کے قیام میں معلوم ہوا کہ اس قبیلہ میں پچھبیت کوٹ کوٹ کے بھڑی تھی۔ لڑائی ہے تو سالہا سال اور نسلانہ بعد نسل جاری رہے گی۔ دوستی ہے تو اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں گے۔ خود فائدہ کر لیں گے لیکن مہمان کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیں گے۔ اسی طرح غالب اپنی پنشن کا مقدمہ ایک دو برس نہیں مسلسل ۴۴ برس تک لڑتے رہے۔ انھوں نے اس زمانے کی صریح بے انصافیوں کے خلاف جس کی شکایت بعض ایسا نڈار انگریزوں

کو بھی تھی اور خود مقامی حکام کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کی۔ جب وہاں بھی وادہ سی نہ ہوئی تو کمپنی کے ڈائریکٹروں اور آخر میں ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ان کی دستجو بھی ایک معنی میں اسی سلسلے کی پویش مندانہ کوشش ہے۔ جب حامیان قتل سے معر کے اور مجادلے ہوئے تو غالب اس طرح لڑے جیسے ترک اور تورانی لڑتے ہیں۔ ان ترکی قبیلوں کو اپنی عزت اور آبرو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ غالب پر فائق گذر رہے تھے لیکن وہلی کالج کی ملازمت کے معاملے میں انھوں نے صحیح یا غلط 'عزت' کا سودا نہیں کیا۔ جوئے کے الزام میں قید ہوئے تو جیسر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجرم کی نہیں بلکہ بادشاہ کی سواری اس زنداں خانہ میں داخل ہو رہی ہے۔ اسی طرح جیم زخموں کی کثرت سے سرو چراغاں بن گیا ہے اور موت ہے کہ روز دروازے پر دستک دیتی ہے لیکن جب توہین کا سوال پیدا ہوتا ہے یا ان کی حیثیت عرفی پر ضرب لگتی ہے تو وہ مولوی امین الدین پشاوروی کے خلاف مرنے سے دو برس پہلے انگریزی عدالت میں ازالہ حیثیت کی نالش کرتے ہیں۔ اثنائے تحقیقات میں وئی کے بعض اہل قلم عدالت میں بلانے گئے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں ان سے دشنام و فحش مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ ان حضرات نے ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان جملوں کے ایسے معافی بیان کیے جن سے ملزم کی بھجت ہو جائے۔ کسی نے پوچھا حضرت یہ تو آپ کے شناسا ہیں، انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ فرمایا: میری، بیکسی کی وجہ، شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے اور چونکہ شرافت نسبی میں کوئی مسیہرا ہم جنس نہیں ہے، اس لیے میرا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

بہرچہ درنگری مجز بہ جنس مائل نیست

عیار بیکسی من شرافت نسبی ست

قدیم ترکوں میں ایک قسم کی دنیا واری، عقل معاش، عیش پسندی اور پرکاری بھی ملتی ہے جو مختلف گروہوں سے مقابلے کی شدت سے آئی ہے اپنے مقاصد کو

حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی حقیقت نہیں اٹھا رکھتے۔ غالب کا جو یہ نواب شمس الدین خاں یا خود اپنے بھائی مرزا یوسف یا اپنے عزیز دوست مفتی صدر الدین آزاد کی جود کے ساتھ تھا وہ ہمیں بڑا عجیب اور قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ان کے طبقے کی مجبوریوں کو بھی دخل ہے اور اس قسم کی متوازی مثالیں ہمیں آخر دور مغلیہ میں بھی مل جاتی ہیں، جہاں مقصد زیادہ اہم ہے اور طریقہ کار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

نوکوں میں اصابت اس کے ساتھ تنقید کی شدت اور عدم برداشت پائی جاتی ہے۔ باوجود ہزار محبت اور عقیدت کے وہ اداروں اور شخصیتوں کی ہکتہ چینی میں پس و پیش نہیں کرتے۔ جہانگیر کے دربار میں حضرت شیخ سلیم چشتی کے فیوض روحانی کا ذکر تھا۔ قاضی نور اللہ شوستری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ یہ ذکر اچھا نہ معلوم ہوا فرمایا: آنجو مردک ہو۔ جہانگیر حضرت شیخ سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا۔ ان ہی کی دعا سے پیدا ہوا تھا حکم دیا کہ مولانا کا سر قلم کر دیا جائے۔ نور جہاں نے رحم کی درخواست کی اس نے کہا: جاناں دل دا وہ ام نہ ایمان۔ اور نگ زیب نے اپنے اٹاؤ پر سخت ہکتہ چینی کی تھی کہ تم نے مجھے یورپ کی تاریخ نہ پڑھائی اور ہمیشہ ہی کہتے رہے کہ دنیا میں بس مغل ہی مغل ہیں۔ اسی طرح غالب نے باوجود دخل ہونے اور مغلیہ تہذیب سے محبت رکھنے کے آئین اکبری پر اعتراض کیا ہے اور اس پر آئین فرنگ اور منہابی داود دانش کو ترہج دی ہے۔ یہی معاملہ غالب کا شاعری کے میدان میں ہے۔ ایک خط میں حمزہ کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہ نظم ہے یہ عجب ہے حمزہ تو آدمی تھا یہ مطلع جبریل کا بھی ہو تو سند نہ جانو“

غالب مغل تھے، ہار چکلا، قد کشیدہ، رنگت خوب کھلتی ہوئی۔ ان کی رگوں میں وہی خون موج زن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح ان کو زندگی کی ایسی چیزوں سے محبت تھی۔ اچھا کھانا اچھا پینا، اچھا رہن بہن۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی اور غالب کے دادا کی زبان بھی ترکی تھی۔ لیکن مغل ایرانی تمدن میں اس قدر مرشار تھے کہ انہوں نے اپنے کمالات کے جوہر فارسی میں دکھلائے اور اس کو

اپنی تہذیبی اور سرکاری زبان قرار دیا۔ پروفیسر آدبری نے لکھا ہے کہ عربوں کے اثر سے فارسی زبان بھی صحرازدہ بولنے والی تھی اور ہندوستان کے طبعی ماحول نے تو اس کے رنگ و آہنگ کو ایران کے طرز و روش سے اس قدر مختلف کر دیا تھا کہ ہندوستان کے اسلوب کو سبک ہندی قرار دیا گیا۔ اس طرز کی بہت عیب جوئی کی گئی ہے جس پر چنداں حیرت نہیں لیکن افسوس اس کی ہندو متی پر ہے۔ متاخرین شعرا کی بدولت اس میں جو حسن کاری کا عنصر پیدا ہوا۔ اس کا عدم اعتراف بدترین قسم کی نا فکرمندی ہے۔ اس قسم کا تخیل کہ غزالے بہ صحرا سے جان می گذشت یا ہمد آہوان صحر اسد خود نہادہ برنگ ، یا آردہ میں ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام یا آہو آجائیں گئے خود شوق سے گردن ڈالے ، ہندوستان بھی کے طبعی ماحول میں ممکن ہے ، تہہ مز و طوس میں ممکن نہیں۔

غالب کے اجداد کو ہندوستان میں آکر جس ماحول اور مزاج سے سابقہ پڑا ، وہ وسط ایشیا سے مختلف تھا۔ یہ لوگ جہاں آکر بسے وہ بالعموم سطح اور کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل تھا جنہیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ یہاں گھنے جنگل تھے یا وسیع و عریض میدان۔ یہاں کے موسم مقرر تھے اور ان میں زیادہ افراط و تفریط نہیں ہوتی تھی۔ یہاں حقیقت ایسے زمان میں کام کرتی ہے جو سمجھور و مسلسل ہے اور بہ اعتبار پیمائش واپری ہے۔ یہاں کائنات ناقابل اختتام صورت میں ہے تماشا پھیلی ہوئی تھی اور شدت حیات کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔ بظاہر ان مختلف مناظر میں بہت فرق ہے لیکن غور کیجیے تو ساری موجودات اپنی کثرت اور ہولناکی کے باوجود ایک حقیقت نظر آتی ہے۔ موضوع کی وحدت معروض کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے یا تصوف کی اصطلاح میں بندہ و بندہ نواز عاشق و معشوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ہندوستانی ذہن کی ہے وہ کائنات کی تعمیر میں اور نظام فکر کی تعمیر میں ، متعدد اور مختلف مظاہر کو ایک کپلے کے تحت لا کر ہمیشہ ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی عمل اس تہذیبی ورثے کے ساتھ ہوا جو

غالب کے اجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کو ہندوستانی ذہن نے ترکیب و امتزاج کے ذریعے اپنے رنگ میں رنگ لیا چنانچہ جن تصوری عناصر نے ہندوستان کے اجتماعی ذہن پر اثر ڈالا، وہ سب کے سب ہندوستان کی سرزمین میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں بہت سے باہر سے آئے تھے۔ ہندوستانی تہذیب میں دراوڑی، آریائی، ایرانی اور ترکی عناصر کی بڑی آمیزش ہے۔ البتہ وہی عناصر ہندوستانی تہذیب کا جزو بن سکے جو عام ملکی روح سے ہم آہنگ تھے۔ مغلوں کے زمانے میں جو نخل بندی اور پیوند کاری کے تجربات سے گزر چکے تھے، یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہو گیا۔ انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخ دلی اور خود داری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مسادات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر ہندوستانی تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گئی اور اس کی جڑوں میں، جہاں ایرانی شعور اور تصوف کی انسان دوستی مکمل پہنچ گئیں۔ اس زمانے کی عمارتیں، تصویریں، تصوف کی تحریکیں اور شعر و موسیقی کے کارنامے سب اس امتزاج اور اتحاد پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر معرفت یا تصوف کے اس نئے راگ پر غور فرمائیے جو ہندوستان کے طبعی ماحول میں اسلامی اثر سے پیدا ہوا۔ اس میں عاشقانہ ذوق و شوق، سوز و ساز، تسلیم و رضا کے ساتھ مصلحانہ بلکہ مجاہدانہ جوش و خروش بھی ہے۔ ایک طرف نعمت عشق ہے، اوقات الہی کی محبت اور مرشد کی عقیدت سے معمور۔ اور دوسری طرف ترکوں کا نعرہ جنگ ہے، ظاہری رسوم و روایات، عقائد و عبادات کے خلاف، یہاں محبوب حقیقی کا تصور، خالص باطنی تصور ہے جو بظاہر متضاد صفات کا جامع ہے۔ یہی صورت معشوق حقیقی کی ہے اور یہی کیفیت معشوق مجازی کی۔ پھر بھی ایک عارف کی نظر، اس کثرت میں وحدت کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا ازان و مکان سے باہر بھی ہے، تصور سے ماوراء بھی، صفات و قیمنات سے برمی، دارا شکوہ، طالب حسین شاہ حسنی، میرزا مظہر، میرزا جیدل، غلگین اور غالب کے صوفیانہ خیالات کو سامنے رکھیے، سب میں یہی بھی بندی نے کار فرما ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف باہم مل گئے ہیں۔ اسی طرح پنجور سیکری،

احمد آباد اور سری نگر کی عمارتوں میں، خیال اور دھڑلے میں، منور اور عبد الصمد کی تصویروں میں امیر خسرو، رحیم، فیض اور غالب کی شاعری میں یہ استزاجی لہر صاف نظر آتی ہے۔ یہاں امتیازات مٹ گئے ہیں اور فنون لطیفہ نے اپنے حدود کے اندر ہندوستانی بیج کو پالیا ہے۔ ترکی ایرانی شاعری میں غزل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ شاعر ایک حشدِ ایک حیات ایک سمات اور ایک حشر و نشر کے قائل تھے اور ادب میں غزل ایک ہی موضوع پر اپنی لامتناہی دلچسپی اور موزوں الفاظ اور مناسب قافیے کے انتخاب کے ساتھ ایک خاصے کی چیز تھی۔ مضمون کے لحاظ سے اس کا خود کفالتی انداز یا اقلیدسی نقش و نگار کی طرح ایک شعر کا دوسرے شعر سے صرف باہمی صوتی، عینی، تعلق اسی شعور کا شاعرانہ اظہار ہے۔ یہ ذہن پر شور ریختاں اور فلک نیلگوں کی پہنائیوں میں پلا اور بڑھا تھا چنانچہ نسیب کی شکل میں غزل کی ابتدا عربستان میں ہوئی ترقی ایران میں۔ لیکن وہ اپنے نقطہ کمال کو ہندوستان میں پہنچی۔ جہاں کی ریزہ کار فضا، کثرت میں وحدت کو دیکھ سکتی تھی اس قسم کی صنعت اس کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق تھی۔ اس لیے غزل نے تمام ہندوستانی ادبیات پر اثر ڈالا اور خسرو، فیض، عرفی و نظیری، طالب و کلیم، ظہوری و بیدل، میر و درد، مومن و غالب کے جوہر اسی مزین پر نمایاں ہوئے جن کی بدولت غزل اپنے منہاں کمال پر پہنچ گئی اور یہ بات بھی نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ غالب کے اختراعی کمالات کا اصلی میدان غزل ہی ہے نہ قصیدہ ہے نہ مثنوی، نہ مرثیہ نہ رباعی۔ قصیدے میں انھوں نے کہیں خاقانی کا تسبیح کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا، کہیں عرفی و نظیری کا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک منزل کا میابی سے ملے کی ہے لیکن وہ قصیدے کو عریض نویسی کا ایک رسی ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ایک قصیدہ کو معمولی قصرت کے ساتھ دودھ و مدوحین کے سامنے پیش کیا اور اس کو صرف وسیلہ روزگار سمجھا ہے۔ ان کی کوئی مثنوی فردوسی، رومی، نظامی یا جامی کے مقابلے پر پیش نہیں کی جاسکتی البتہ بعض بعض ٹکڑے بے مثل ہیں اور ہندی فارسی ادب کی آبرو۔

یہی صورت رباعی کی ہے کہ اس سرایے کو فارسی کے رباعی گوہوں سے کوئی بڑی نسبت نہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ "مرزا کے کلام میں غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ غالب کو جو خیالات اور احساسات اپنے ورثے، اپنے ماحول اور اپنی مخصوص افتاد طبع کی بدولت ملے تھے ان کا جتنا خوب صورت اظہار غزل میں ہوا ہے وہ اور کسی صنف میں نہیں ہوا۔ ان کی تشبیہات استعارات و ترکیبات اپنے اندر جہاں معنی پھیلے ہوئے ہیں ان کے ذریعے غزل کا آرٹ نکھر گیا ہے اور زبان و بیان اپنی نئی بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان دیکھوں سے ہم غالب کی اس حسین معنویت، امتزاجی بصیرت اور شوخ ذہانت کا نظارہ کر سکتے ہیں جو ایرانی ترکیبندی خصوصیات کی نخل بندی کا نتیجہ ہے اور جو اردو کی سب سے بڑی دولت ہے۔ غالب نے غزل کے ذریعے صدیوں کی بھولی بھری یادوں اور خون گشتہ تمناؤں کو آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے۔ نئی طرح سے نیستی کو، ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر محدود محض ہونے کی متناکی ہے یا نشاط کا کار کو نصیب قلیل پر منحصر کیا ہے یا رخصت عمر اور سوار کی بے اختیاری کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا پر رکاب میں۔ یا وجود بھر کو نمود و صورت پر مشتمل سمجھا ہے یا اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے یوں دہائی دی ہے کہ کوچ جہاں پر حرف مکر نہیں ہوں میں۔ یا تسلیم کی خواہش کرنے کی کوشش کی ہے یا اپنے مذہب کو یوں ظاہر کیا ہے کہ جب تمہیں مٹ گئیں تو اجڑے ایماں جو گئیں یا دوست کے سر انگشتِ خانی کے تصور کو ظنیت سمجھا ہے یا بہار کا اثبات اس طرح بھی کیا ہے کہ ہوئے مہر و تماشاں یا چشم تنگ کو کثرتِ نظارہ سے داکوئے کی صلاح دی ہے یا دنیا کو باز بچہ اطفال سمجھا ہے یا یہ حسرت ظاہر کی ہے کہ بہت بچکے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم بچکے۔ یا کوہِ طور کی سیر کا نیا دلولہ پیدا کیا ہے یا گرم فزاری

کا یہ عالم دکھایا ہے کہ راستے کے تمام خس و خاشاک کے جلنے سے راہ گیمروں کے لیے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ یادداشت اسکاں کو ایک نقشِ پاسے تعبیر کیا ہے یا افرادِ شوق کو یوں ظاہر کیا ہے کہ فیضِ خود بشکن بر سرِ پیانا ما۔ آگے جانے کی یہ جلدی ہے کہ سایہ و سرِ چشمہ یعنی طوبی و کوثر پر آرام گوارا نہیں یا رازِ نہاں دار پر کہنا چاہتا ہے، اور منبر پر نہیں۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ سزا ستانے پر اور قدم بہت کدے میں۔ اعداؤں نفس کا یہ حال ہے کہ دانے کی لالچ میں گرفتار ہونے کو تیار نہیں بلکہ یہ چاہتا ہے کہ نفس کو اتنا اونچا کیا جائے کہ وہ اس کے آشتیاں تک پہنچ جائے مضبوط ہوش و خرد کا یہ عالم ہے کہ کمیشِ مغاں پر غلبہ حاصل ہونے کی امید نہیں تو اس کا مذہب اختیار کرنے کو تیار ہے کہ اس طرح شرابِ جزیرہ میں نہ آئے گی تو دہیہ اور سوغات میں تو ضرور آئے گی۔ یا انسان کی بے بضاعتی اور مجبوری یہ کہ ہفت آسمان جگردش و ما در میان او۔ دوسرے الفاظ میں قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں ایک ہیں اور جوشِ تناسل دیدار کا یہ حال کہ وہ آنسوؤں کی طرح پلکوں کے راستے سے ٹپکا جاتا ہے تاہم آرزوؤں اور ارادوں کا وہ جھوم کہ معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم دونوں مل کر بدل دیں اور حکمِ قضا کو رطلِ گراں کی گردش سے بھریں اور اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں اور اس کو بکجائی کی اطلاع نہ ہونے دیں۔ یہ اور قسم کے خیالات، غالب کے یہاں بار بار ملتے ہیں جن میں زندگی کی حقیقتوں کا عرفان، اس کا نور و نکہت، بیسنے کا سلیقہ اور حوصلہ سب ہی شامل ہے اور جو ان کے کڑے ہوئے ذہن اور لپے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہیں۔

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ان خیالات کی گونج اُردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں مطلق نہیں سنائی دیتی۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تیور، یہ رچاؤ، یہ انداز و اسلوب۔ یہ طرح واری، یہ نشاطِ معنوی دوسرے کے یہاں اس درجے میں نہیں ہے اور یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی میں وسطِ ایشیا کی

ہم جوئی اور قومی العزمی، ایران کی ریگینی و لطافت اور ہندوستان کی تاب و پیش،
 تحت الشعور میں ہم آمیز ہو کر شعر کے قالب میں وصل جائے۔ غالب کو خود اس منوی
 وراثت کا پورا احساس تھا جو کئی واسطوں سے گزر کر ان کو ہندوستان میں ملی تھی۔ فرماتے
 ہیں کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کے فتوحات کے وقت ہجرت سے چھینا اس کے عوض میں مجھے
 کہ میں بھی عجیب الاملا ہوں کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتش کدہ ایران جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے آتش
 کی جگہ نفس یعنی زبان دی اور جب بت خانہ ڈھ گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔
 شاہان ہجرت کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے بدلے میں مجھے خامہ تجنیہ نشاں
 عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں قبال کیا فی
 رحمت فرمایا۔ موتی تاج میں سے توڑ لیے اور علم و دانش میں بجا دیے یعنی جو کچھ
 علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے سے دے دیا۔ آتش پرستوں سے جو شراب جزیلے
 میں لے لی وہ مجھے ماہ رمضان کی شب جمعہ کو بخش دی۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ پونجی
 میرے اجداد سے لوٹی تھی اس میں سے صرف مجھے زبان مندریاد کرنے کے
 لیے بخش دی۔

مرثوۃ صبیح دریں تیرہ شبانم داوند
 شمع کشتند دوزخ و رشید نشانم داوند
 رخ کشوند و لب برزہ سرایم بستند
 دل ریوند و دو چشم بگرا نم داوند
 سوخت آتش کدہ ز آتش نفس بخشیدند
 ریخت بتخانہ، ز ناقوس فنا نم داوند
 گہر از رایت شاہان عجبم برچیدند
 بعوض خامہ تجنیہ نشانم داوند
 افسر از تارکب ترکان پشتنگی بردند
 بہ سخن ناصیہ فر کیا نم داوند

گوہر از تاج گستند و ہرانش بستند
 ہرچہ بُردند بہ پیدای بہ نہانم دادند
 ہرچہ در جزیرہ ز گبران سبے ناب آوردند
 ہشہب جمعہ ماہ رمضانم دادند
 ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بُردند

تا بنالیم ہم از اس جملہ زبانم دادند

یوں تو ہندوستان پر ایران کا اثر دارا (Darius) کے زمانے سے شروع ہوتا ہے لیکن مغلوں کے زمانے میں ترکی ایرانی دھارے مل گئے تھے۔ ہندوستان کی خصوصیات کی آمیزش نے اس تہذیب کا حسن ایسا نکھار دیا کہ آج دیکھ آئیے کو کہتی تھی کہ اللہ ری میں

غالب کے یہاں جو نشاط و مطالب کا رقص اور لفظ کا حسن ہے اس کا بھی سرچشمہ یہی ہے۔ ان کا انداز و اسلوب، ایرانی ہندی امتزاج کے اس نقطہ ارتقا کو ظاہر کرتا ہے جس کو تادمخ عرصے سے طے کر رہی تھی اور جس کا فن تعمیر میں سب سے خوب صورت اظہار تاج محل کے مرمر میں اور میرا تراش جسم میں نظر آتا ہے۔ غالب کی شاعری، افسون و افسانہ نہیں ہے، اس میں نفسِ محرم کی آمیزش ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے، خونِ جگر کی کی نمود ہے۔ انھوں نے میں نے خیالات دیے ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور اس میں مغل قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پُر معنی اختصار ہے، اس کا ترکا نہ بانچہن ہے۔ یہ انداز و اسلوب، حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔

غالب کے نظریے حسن و عشق کی تعمیر میں بھی ان کی تمدنی دراشت، ان کی رنگارنگ شخصیت اور ان کی نسل اور ان کے خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب کے وصل کو بہارِ تماشا کے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں۔ دیروحم کو آئینہ منکرِ امتسا

اور پیشِ امر و ذکرِ زندگی کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذہنی تحسیر یہ نہیں بلکہ تجربے اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث، مجازی مادی اور انسانی ہیں اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ مرزا غالب نے اس وقت، ہوش کی آنکھ کھولی جب مغلیہ سلطنت کی شمع بجھ رہی تھی۔ لارڈ لیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں اور شہنشاہِ عالمِ عالمیان کی حکومت قلعہ معلیٰ تک رہ گئی تھی۔ ۱۷۵۷ء کی بغاوت میں یہ رقصِ شہر بھی ختم ہو گیا۔ نہ وہ قدح باقی رہا نہ وہ ساقی لیکن غالب، ان حوادث کو اپنے دریائے بیتابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور اس ظلمت میں انھوں نے زندگی کو سنبھالا اور سنوارا بھی۔

غالب اس تہذیبی سلسلے کی کڑی ہیں جو ہمیں ازبکستان، ترکستان، تاجیکستان، افغانستان اور ایران سے ملاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب حضرت پیر و مرشد ڈاکٹر ڈاکٹر حسین مرحوم نے جشنِ غالب کی بین الاقوامی تنظیم میرے سپرد کی تو مجھے یونیسکو پیرس میں ڈاکٹر طہ حسین، ازبکستان میں ڈاکٹر شاہ اسلام محمدوف، روس میں پروفیسر غفوروف، اطالیہ میں پروفیسر بوسانی، انگلستان میں مشر الف رسل، چیکو سلاواکیہ میں پروفیسر یان مارک، ایران میں آقاسے صورتگر، کناڈا میں پروفیسر عبدالرحمان بادر اور امریکہ میں پروفیسر شیل کے ہمنا بنانے میں مطلق کوئی دشواری نہیں ہوئی اور ان سب کو میں نے مشرق سے مغرب تک غالب کا طرِ قدر ہی پایا۔

آخر وہ کیا چیز ہے جس نے غالب کو علقہٴ شام و بحر سے نکال کر جاوداں بنا دیا؟ میرے خیال میں وہ یہی ایشیائی ورثے کا تسلسل ہے جو ہمیں غالب کی انسان دوستی، آفاقیت، وسیع المشرتی، دردمندی،

بے نیازانہ خوش طبعی اور معنی لفظِ آدمیت کی شکل میں از سر نو دستیاب ہوا ہے۔ یہ وہی مشرق کے شعور کی زوہے جو قدیم و جدید اور خواب و حقیقت کی واویلوں کے درمیان، بے پروائی اور رعنائی سے بہتی ہوئی اور نا آسودگی اور آرزو مندی کے گردابوں سے کھیلتی ہوئی عالمی ادب کے ماورائی سمندر سے جا ملتی ہے۔

غالب کا مقدمہ پنشن

غالب کے ذہن کو بچنے کے لیے اُن اقتصادی دشواریوں کو ضرور سامنے دیکھنا چاہیے جو ۱۹۴۰ء سال (یعنی کم و بیش ۱۹۳۹ء) سے براہِ ممتلا رہے اور جنہوں نے مرتے وقت تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان مالی پریشانیوں میں اُن کے مقدمہ پنشن کو خاص طور پر دخل ہے جس کی اصلی شکل کا خلاصہ ہم منسلک آرکائیوز نئی دہلی کے شکریے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

غالب کا مقدمہ پنشن (خلاصہ منسلک نمبر) منسلک آرکائیوز نئی دہلی ۱۹۰۱-۱-۱ بجے

ایک رجسٹر جس میں متعدد درپور ہیں داخل ہے۔ (منسلک آرکائیوز۔ دہلی)

۱۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت بنام منری تقویٰ پرنسپ سکریٹری گورنر جنرل آف انڈیا۔

اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بمبئی گورنمنٹ کی چٹھی مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۳۹ء اور ریٹائرمنٹ

دہلی کا خط جس میں غالب کے مقدمہ پنشن کا خلاصہ درج ہے ارسال کیے گئے ہیں۔
خط میں لکھا ہے کہ وائس پریزیڈنٹ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ خان کا خاندان
موجودہ پنشن سے زیادہ کا مستحق ہے۔

- ۲۔ مسٹر جان مالکم کی یادداشت بنام چیف سکریٹری۔
اس کے ہمراہ گورنروں کی تحقیقات کی تفصیلی رپورٹ کی نقل مورخہ ۳ نومبر ۱۸۶۳ء
ارسال کی گئی ہے۔ یہ تحقیقات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ سسر پر لارڈ لیک ہی
کے دستخط ثبت ہیں اور یہ کہ احمد بخش خان کا چال چلن شک و شبہ سے بالاتر تھا۔
- ۳۔ مسٹر جارج موئنٹن چیف سکریٹری کی یادداشت بنام ولیم مالکم ریزیڈنٹ دہلی۔
اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بسبی گورنمنٹ کے ایک مراسلے کی نقل بھی گئی ہے۔
مراسلے میں کہا گیا ہے کہ جس پروانہ پر لارڈ لیک کی مہر ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے نیز یہ
ہدایت کی گئی ہے کہ اس پروانہ کو نواب شمس الدین خاں کو واپس کر دیا جائے۔
- ۴۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۶۳ء غالب کے پنشن
کے معاملے کے بارے میں۔

اس میں کہا گیا ہے کہ نصر اللہ بیگ (خاں) نے جو نواب احمد بخش خاں الہی ریاست
فیروز پور کا داماد تھا۔ مرنے پر ماں ایک بیوہ تین بہنیں اور دو لڑکے (بھتیجے) چھوڑے
خواجہ حاجی نصر اللہ بیگ خاں کے باپ کی بیوی کی بھتیجی کا لڑکا تھا اور نصر اللہ
بیگ خاں کے معاملات کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ اس کی (نصر اللہ بیگ خاں)
وفات پر نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے اپنی جائیداد کے متعلق پروانہ معافی
حاصل کر لیا۔ شرط یہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نصر اللہ بیگ خاں کے ورثہ کے
بے مدد معاش ہیا کرے گا۔ نواب نے ناجائز طور سے خواجہ حاجی کو متوفی کے خاندان
کا اہم ترین فرد بنا دیا۔ اور اس کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ اور باقی تین ہزار
سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور غالب کے خاندان کی گزراؤ اوقات کے
لیے مقرر کر لیے۔ نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ کی وفات پر ان کا حصہ ان کی سب سے

بڑی لڑکی کو ملا جس نے اپنی دو چھوٹی بہنوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ اس
انتظام میں غالب کے بھائی مرزا یوسف کے لیے کوئی رقم نہیں رکھی گئی تھی۔
یادداشت میں غالب کے ۱۸۳۸ء میں کلکتہ جانے اور ۲۸ مارچ ۱۸۳۹ء کو
پرشین سکرٹری کی خدمت میں اپنی عرضداشت پیش کرنے کا بھی ذکر ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۸۹

فاریں ۱۸۳۱ء ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۲۲ مارچ ۱۸۳۹ء

غالب کی درخواست بنام جارج سونٹن سکرٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم
معرور ہے کہ مبلغ دس ہزار سالانہ پنشن کے لیے ان کے حق کو تسلیم کیا جائے اور یہ
رقم فیروزپور کے جاگیردار کی جاگیر (جس کی مالیت مبلغ ۲۵ ہزار ہوتی ہے) پر واجب الادا
قرار دی جائے۔ وہ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ وہ دستاویز جس کے اندر مبلغ ۵ ہزار دینا
طے ہوئے ہیں اور جسے فریق مخالف (نواب احمد بخش خاں) کی جانب سے داخل کیا
گیا ہے۔ عرض گزار کے پنشن کا پورا حق پاتے ہیں (جو مبلغ دس ہزار سالانہ ہوتا
ہے) مانع نہیں ہونا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ یہ پنشن براہ راست سرکاری خزانے سے
ادا کی جائے۔

غالب کا پنشن کیس

۱۰۹۳

نیشنل آرکائیوز، دہلی

کورٹ ریکارڈز بابت ۱۸۳۳ء کی نقل

موردہ یکم ستمبر ۱۸۳۳ء صفحات ۹۹۔ (نیز کچھ سادہ صفحے)

۱۸۳۳ء کا کورٹ ریکارڈ گورنمنٹ آف انڈیا کے مختلف افسران کی یادداشتوں
اور رپورٹوں پر مشتمل ہے جو غالب کے مقدمہ بابت اضافہ پنشن کے مختلف پہلوؤں کے
سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام ارسال کی گئی تھیں۔

- ۱۔ بنام سٹرنہزی تھوبی پرنسپ سکریٹری گورنر جنرل صفحات ۳-۱
- ۲۔ بنام چیف سکریٹری سپریم گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵-۴
- ۳۔ چیف ریزیڈنٹ دہلی صفحات ۹-۱۰ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۸۳۱ء
- ۴۔ اسد اللہ خاں کے مقدمہ میں چیف سکریٹری کا نوٹ صفحات ۱۳-۲۶
مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۳۱ء
- ۵۔ بنام این بی ایڈمنشن اسکاٹ صفحات ۲۹-۳۵ (نواب احمد بخش خاں کے حق میں فارسی پروانہ کا انگریزی ترجمہ صفحہ ۳۵-۳۸)
- ۶۔ بنام ٹیننٹ کرنل مانگم۔
- ۷۔ بنام ایل۔ بی ایڈمنشن صفحات ۲۹-۵۲
- ۸۔ بنام جارج سونٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵۳-۵۲
- ۹۔ پھٹی ہوئی فارسی دستاویز خواجہ حاجی وغیرہ مرقوم ماہ جون ۱۸۳۱ء مطابق ۱۹ ربیع الاول ۱۲۳۱ء
- ۱۰۔ درخواست اسد اللہ خاں بخدمت رائٹ آنریبل لارڈ ولیم ہنٹنگ گورنر جنرل ان کونسل کلکتہ۔ صفحات ۵۹-۶۳
- ۱۱۔ بخدمت لارڈ ولیم کیونٹس گورنر جنرل آف انڈیا صفحات ۹۵-۶۸
- ۱۲۔ بنام ایس فریزر ڈپٹی سکریٹری ٹو گورنمنٹ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۶۹-۷۰ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۳۱ء
- ۱۳۔ آخر میں "دستخط محمد اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونہا بخدمت لارڈ ولیم ہنٹنگ گورنر جنرل آف انڈیا فورٹ ولیم صفحات ۷۱-۷۲
- ۱۴۔ بنام سی۔ نورس چیف سکریٹری ٹو جے گورنمنٹ صفحات ۸۵-۸۶ مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۸۳۱ء
- ۱۵۔ بنام جارج سونٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ۔ فورٹ ولیم۔ صفحات ۸۹-۹۰
مورخہ ۲۷ نومبر ۱۸۳۱ء
- آخر میں "عرضداشت محمد اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار

سونک سونا۔ بست و بلمتم نومبر ۱۸۳۳ء

۱۶۔ بنام جارج سونٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم۔ صفحات ۹۳-۹۴
مورثہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۳ء

۱۷۔ از اسد اللہ خاں، مخدست وائٹ آفیسر راجپوتانہ صفحات ۹۵-۹۸

غالب کا پنشن کمیس

۷۹۱

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فاریں۔ ۱۸۳۳۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۳ اپریل ۸۰-۱

غالب کی درخواست بنام مسٹر سونٹن چیف سکریٹری
یہ درخواست ان خدمات پر مشتمل ہے جو اہل برطانیہ کے ہندوستان پر قابض
ہونے سے پیشتر ان کے باپ اور چچا نے انجام دی تھیں۔ موخر الذکر برطانوی
حکمرانوں کی جانب سے آگرہ کا حاکم تھا۔ سائل اس بات کی درخواست کرتا ہے کہ
جو واقعات اس نے اپنی مرضی میں بیان کیے ہیں سرکاری ریکارڈ سے ان کی تصدیق
کی جائے۔ تراں بعد اس سلسلے میں اسے ضروری سند (سرٹیفکیٹ) عنایت
کیا جائے۔

۲۔ غالب کی درخواست بنام مسٹر سونٹن چیف سکریٹری

اس میں کہا گیا ہے کہ ۲ مارچ ۱۸۳۱ء کو برطانوی حکومت نے ان سپاہیوں
سواروں کا چارج جو اس سے پیشتر اس کے مرحوم چچا کی کمان میں تھے۔ فیروزپور کے
جاگیردار نواب احمد بخش خاں کو دیا تھا۔ وہ درخواست کرتے ہیں کہ فیروزپور کی جاگیر
میں ان کے حق کی رقم کا تعین کیا جائے۔

غالب کا پنشن کمیس

۷۹۳

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فاریں۔ ۱۸۳۶۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۵ دسمبر نمبر ۱۵۹-۶۱

۱۔ درخواست غالب بنام ڈبلیو ایچ میکنٹن۔ سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم چونکہ لیفٹنٹ گورنر آگرہ نے ان کی درخواست کو از روئے شفقت ملاحظہ نہیں فرمایا اور گورنر جنرل نے ان کے فیصلے کو بحال رکھا ہے لہذا معروض ہے کہ سائل کے معاملے کو یا تو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے پاس منتقل کر دیا جائے یا انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے حضور میں ارسال کر دیا جائے۔

۲۔ درخواست غالب بخدمت لارڈ آئکنلٹنڈ گورنر جنرل آف انڈیا۔ فورٹ ولیم سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے اس بات کی اطلاع پانے پر کہ ان کا دعویٰ خارج کر دیا گیا ہے غالب کی گورنر جنرل کے حضور میں معروض ہے کہ
۱۔ انہوں نے لیفٹنٹ گورنر آگرہ کے فیصلے کے خلاف سات نکات کا اعتراض داخل کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ ان کے جوابات ان سے (لیفٹنٹ گورنر سے) مانگے جائیں۔

۲۔ اگر ان استفسارات کے جوابات آجائیں تو ان کی ایک نقل درخواست گزار کو مرحمت کی جائے لیکن اگر اس کی (جواب منگانی کی) ضرورت نہ بھی جائے تو ان کے بارے میں درخواست گزار کو مطمئن کیا جائے۔

۳۔ لہذا اب وہ ملتیں خدمت ہے کہ اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے فیصلے کے لیے بھیج دیا جائے لیکن اگر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے ان وجوہ کے متعلق مطمئن کیا جائے جن کی بنا پر اس کا دعویٰ خارج کیا گیا ہے۔

۴۔ مزید برآں معروض ہے کہ اگر گورنر جنرل اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت میں نہ بھیجے گا فیصلہ کریں تو اس معاملے سے متعلق جملہ کاغذات انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے فیصلے کے لیے بھیج دیئے جائیں۔

ملفوظ جملہ کاغذات متعلقہ مقدمہ نیز مرقوم الصدر مکاتیب

نوٹ : اس درخواست کے جواب میں غالب کو سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کلکتہ کی جانب سے یہ اطلاع ملی کہ ان کے کاغذات کو رٹ آف ڈائریکٹرس کو بھیجے جا رہے ہیں۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۷

قارن - ۱۸۳۷ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز - دہلی

۱۷ اپریل نمبر ۶۶ - ۶۷

۱۔ درخواست غالب بنام ڈپٹی ایچ میکناٹن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم۔

معروض ہے کہ مبلغ ۲۰۳۰۰ روپیہ کا جو اس کا بقایا واجب الادا ہے مرحوم شمس الدین خاں کے ترکہ کے مبلغ ۲۹۰۰۰ روپیہ میں سے جو گورنمنٹ کے پاس جمع ہیں وضع کر دیا جائے اور شمس الدین خاں کی جائداد کی فروختی سے سائل کا پھل پنشن کا بقایا بحساب مبلغ ۳۰۰۰ سالانہ تا اختتام اپریل ۱۸۳۷ء دلویا جائے نیز کورٹ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے تک اسے ۳۰۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن بلانا عہدہ ادا کرائی جائے۔

۲۔ غالب کے خط کے جواب میں سکریٹری گورنمنٹ نے ان کے مراسلہ قصیدہ فارسی کے بارے میں گورنر جنرل کی جانب سے اظہارِ خوشنودی کیا ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۸ - ۸۰۰

قارن - ۱۸۳۷ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۸ اگست نمبر ۹۳ - ۹۵

۱۔ مشر ایچ میکناٹن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے نام غالب کا وضاحتی مکتوب جس میں ان کے مقدمہ پنشن سے متعلق جو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے زیرِ سماعت تھا کچھ مزید معلومات درج ہیں۔

۲۔ غالب کی درخواست بحکمہ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ان کونسل فورٹ ولیم۔
(نٹ: دو ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ جو پہلے خواجہ حاجی کو اور اس کے بعد اس کے

ورثا کو ملتا تھا اس کے خلاف اپیل ہے۔

ب : اگرچہ اس کے معاملے سے متعلق تمام کاغذات داخل کیے جا چکے ہیں پھر بھی معاملہ کی صورت حال کا اختصار ضروری ہے اور سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ج : جبکہ چار سو سواروں کا رسالہ جو میرے چچا کی ماتحتی میں تھا توڑا گیا تو اس میں سے بچا جس سوار منتخب کر کے نواب احمد بخش خاں کی ماتحتی میں دے دیئے گئے، بوخرا لڈکر نے خواجہ حاجی کی خدمات کو جو قدیم رسالے میں سب سے پرانا افسر تھا برقرار رکھا اور اسے ان بچا سواروں کا افسر مقرر کیا۔ خواجہ حاجی محض ایک ملازم کی حیثیت رکھتا تھا جسے جلد پندرہ ہزار سالانہ کی رقم میں سے جو سواروں کی نگہداشت کے واسطے منظور ہوئی، یعنی مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ کا الاؤنس ملتا تھا۔

خواجہ حاجی کی وفات پر اس کا منصب سابقہ شرائط کے مطابق اس کے لڑکوں کو دے دیا گیا۔ لیکن جب نواب احمد بخش خاں کی جاگیر ضبط ہوئی اور بچا سواروں کا رسالہ توڑ دیا گیا تب بھی تعجب ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ برقرار رکھا گیا۔ اگرچہ مناسب بات یہ تھی کہ خواجہ حاجی کے ورثا کو ان کے خاندان کی خدمات شایستہ کے پیش نظر کچھ پنشن دے دی جاتی۔

د : مزید برآں اس کے میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے لیے جاگیر کی آمدنی مبلغ

۲۵ ہزار روپیہ سالانہ ملے ہوئے تھے۔ یہ پورے کا پورا وظیفہ میرے چچا کے

وارثوں کو ملنا چاہیے تھا اور اس میں خواجہ حاجی اور اس کے وارثوں کا کوئی

حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا بشرطیکہ موجودہ فیصلہ لارڈ لیک کی رپورٹ مورخہ

۴ مئی ۱۸۵۷ء کی بنیاد پر کیا جائے لیکن اگر گورنر آف ڈائرکٹریٹس کا فیصلہ

فارس شہر پر مبنی ہو تب بھی میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا ہی پانچ

ہزار روپیہ سالانہ پنشن کے مستحق ہیں۔ خواجہ حاجی کی زندگی میں مبلغ پانچ ہزار

روپیہ سالانہ میں سے جو میرے چچا کے ورثا کے لیے مقرر ہوئے تھے اسے دو ہزار

سالانہ کا وظیفہ دینے کی شاید کوئی توجیہ ہو سکے مگر اس کے وارثوں کو اس رقم

(مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ) پر استحقاق جتانے کا کوئی حق نہیں ہے کیوں کہ ان کا نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان سے جو اس خاندان کے مورث اصلی تھے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہذا معروض خدمت ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کا دو ہزار سالانہ کے لیے استقرار حق کا دعویٰ باوجود لیفٹنٹ گورنر کے سابقہ فیصلے کے جو ان کے حق میں تھا نامنظور کیا جائے اور اگر انھیں کوئی وظیفہ ملنا ہی ہے تو وہ انھیں اصل چندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم میں سے دیا جائے جو رسالے کی نگہداشت کے واسطے مقرر ہوئی تھی۔

۳۔ ڈبلیو ایچ آفیشیئلنگ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم کی رپورٹ بابت اس امر کے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد کن وجوہ کی بنا پر نواب احمد بخش خاں کو چندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم معاف کی گئی تھی۔

۴۔ فارسی شہد لاہور ایک نے مرحوم سید کو لکھا تھا اور جس کے اندر نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ دیا گیا تھا اور جس میں سے مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کے واسطے متعین کیے گئے تھے۔

۵۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کی جنھی مرضہ ۲۸ اگست ۱۸۴۲ء بنام مرزا غالب جس میں انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ آئندہ جلد درخواستیں اور کاغذات وغیرہ صرف لیفٹنٹ گورنر آگرہ ہی کے توسط سے بھیجا کریں۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۵ - ۸۰۳

نیشنل آرکائیوز - دہلی

فان ۱۸۴۲ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۹ جون - نمبر ۱۲۸ - ۳۰

۱۔ غالب کی جنھی مرضہ ۲۰ مئی ۱۸۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا - الہ آباد

معرض ہے کہ ملفوظ یادداشتیں جو اس کے اضافہ پیش کی درخواست اور قصیدہ فارسی (جس کے اندر گورنر جنرل کی مدح سرائی کی گئی ہے) کے متعلق ہیں۔ لارڈ ہسٹون کی خدمت میں پیش کر کے ان پر موصوف کے احکام حاصل کر لیے جائیں۔ غالب یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ حسب سابق آئندہ بھی انھیں اپنی معروضات اور خطوط براہ راست بذریعہ ڈاک بھیجنے کی اجازت دی جائے۔

۲۔ ملفوظ یادداشت مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۴۸ء بخدومت لارڈ ڈالین گورنر جنرل آف انڈیا میں اپنے دعوائے اضافہ پیش سے متعلق خاص نکات پر زور دیا ہے اور عرض کیا ہے کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں اپنی زندگی میں ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر پر جو انھیں برطانوی سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئی تھی، قابض تھے اور اس کے بالعوض چار سو سواروں کا رسالہ تیار رکھتے تھے۔ ان کی رفات پر ان کی جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔ اور رسالہ توڑ دیا گیا۔ پھر بھی لارڈ ڈیک نے اپنی رپورٹ مورخہ ۴ مئی ۱۸۴۸ء میں مرحوم کے خاندان کے لیے مبلغ دس ہزار روپیہ سالانہ کی پیش کی سفارش کی۔ اس رقم کی ادائیگی نواب احمد بخش خاں کے ذمہ کی گئی۔ غالب کا بیان ہے کہ نواب صاحب نے ان کے خاندان کو مبلغ دس ہزار سالانہ میں سے صرف تین ہزار روپیہ سالانہ دیے اور بعد میں نواب صاحب کے ورثا بھی یہی رقم دیتے رہے۔ شمس الدین خاں کے قتل کے بعد فیروز پور بھڑک کی جائیداد حکومت نے ضبط کر لی۔

۱۸۴۸ء میں مقدمہ اس وقت کے پریزیڈنٹ ڈبلیو۔ بی۔ بیلی کے تصفیے کے لیے

دائر کیا گیا اور چار سال بعد لارڈ ڈینٹنگ نے اسے خارج کر دیا۔ ۱۸۴۸ء میں مرزا غالب نے اس معاملے کو پھر کورٹ آف ڈائریکٹرز کی نظر ثانی کے لیے پیش کیا۔ غالب عرض کرتے ہیں کہ پانچ سال گزر گئے مگر ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اپنے انقطاعی فیصلہ کا اعلان نہیں کیا۔ سائل اس بات کی بھی درخواست کرتا ہے کہ اسے اپنا پورا وظیفہ لینے کی اجازت عطا کی جائے اور چونکہ نے گورنر جنرل کو پچھلے گورنر جنرل کے مقابلے میں زیادہ اختیارات عطا کیے گئے ہیں، سائل کی درخواست کو شرف قبول

بخشا جائے۔

۳۔ فی ایچ میڈوک سکرٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کی جنھی بنام مرزا غالب۔

فی ایچ میڈوک لکھتے ہیں کہ :

پنشن اور وظیفہ وغیرہ کا فیصلہ سابق گورنمنٹ کرکچن میں جن کی کورٹ آف

ڈائریکٹرز نے پورے طور پر توثیق کر دی ہے۔ آخر میں یہ اطلاع دی ہے کہ لارڈ صاحب اس موضوع پر کوئی اور درخواست قبول نہیں کر سکتے۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۶ - ۸۰۷

نیشنل آرکائیوز - دہلی

نارن ۱۸۴۲ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۶ جولائی نمبر ۱۳۲ - ۴۳

۱۔ غالب کی جنھی مورخہ ۵ جون ۱۸۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک سکرٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا۔

درخواست کرتے ہیں کہ ملفوف یا دواشت کو مع اصل فارسی خط کے جو سکرٹری نے گورنر جنرل کو بھیجا تھا موخر الذکر کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں۔ غالب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرز کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

۲۔ ملفوف یا دواشت مورخہ ۵ جون ۱۸۴۲ء بمقام لارڈ ایلن ہرا گورنر جنرل فی ایچ میڈوک کی تحریر مورخہ ۳۰ مئی ۱۸۴۲ء کے جواب میں معاملہ زیر بحث کے واقعات ظہور بند کرتے ہیں جس میں (مسٹر میڈوک کی تحریر میں) اطلاع دی گئی ہے کہ اس بارے میں اور کوئی درخواست برائے ملاحظہ منظور نہ کی جائے گی۔

غالب کہتے ہیں کہ چونکہ وہ سابقہ گورنمنٹ کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھے اس لیے انہوں نے لارڈ صاحب کے پیشرو سے درخواست کی تھی کہ ان کے معاملے کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے ملاحظہ کے لیے بھیج دیا جائے۔ یہ استدعا ۱۸۴۳ء میں منظور ہوئی۔ دو سال بعد غالب نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے بارے میں دریافت کیا تو

انھیں اطلاع دی گئی کہ یہ معاملہ ۱۸ مئی ۱۹۴۹ء کو دہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۹ء تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ لیکن سکرٹری میڈوک کے خط سے معلوم ہوا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے سابق گورنمنٹ کے فیصلے کو بحال رکھا ہے غالب اب گورنر جنرل سے درخواست کرتے ہیں کہ اس فیصلے کی ایک نقل مع اس کی تاریخ کے انھیں مرحمت فرمائی جائے۔

۳۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی چٹھی مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۹ء کا اقتباس :

”اسد اللہ خاں کا دعویٰ مناسب وجوہ کی بنیاد پر خارج کر دیا گیا ہے۔“

یہ اقتباس غالب کو ایک وضاحتی چٹھی مورخہ ۱۵ جون ۱۹۴۹ء (جس پر فی ایچ میڈوک کے دستخط ہیں) کے ذریعہ بھیجا گیا۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۸ لغایت ۸۰۹

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء نمبر ۲۸۰-۸۳

۱۔ غالب کی چٹھی مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک سکرٹری نو گورنمنٹ درخواست ہے کہ ملفوظ عرضی کو گورنر جنرل کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں اور جن تاریخ کو یہ عرضداشت انگلستان ارسال کی جائے اس سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ ملفوظ درخواست بخدومت لارڈ ڈالین براگورنر جنرل مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء درخواست ہے کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے خلاف اس کی درخواست اپیل کو برعکس ملکہ منظرہ کے پاس روانہ فرمائیں۔

۳۔ فی ایچ میڈوک کی چٹھی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء

گورنر نے سائل کی عرضداشت کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کے پاس پہلی ڈاک سے بھیجنا منظور کر لیا ہے۔

۴۔ مرزا غالب کی چٹھی مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء بنام فی ایچ میڈوک۔

شکریے کے ساتھ مکتوب الیہ کی چٹھی مورخہ ۵ اگست ۱۹۴۲ء کی

رہید دی ہے۔

غالب کا پنشن کیس

فاریں ۱۸۴۴ء - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۳ نومبر نمبر ۴۰-۴۱

- ۱۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے مکتوب مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۴ء کا اقتباس جو غالب کو بھیجا گیا۔
”یہ یادداشت کمیشن برائے تحقیق احوال ہندوستان کے پاس بھیج دی گئی ہے۔“
- ۲۔ غالب کی چٹھی بنام آئی۔ کری سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
معروض ہے کہ ملفوف یادداشت گورنرل کے ملاحظے کے لیے پیش کر دی جائے۔

دستخط

رقیبہ نیاز امیدوار اعلیٰ درجہ

اسد اللہ

- ۳۔ غالب کی درخواست مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۴ء بمقامت سرمنٹری ہارڈنگ گورنر جنرل معروض ہے دو سال ہوئے کہ انھیں سرمنٹری ایچ میڈوک سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے مطلع کیا تھا کہ غالب کی یادداشت کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بھیج دی گئی ہے لیکن چنوز اپنے معاملے کے متعلق انھیں (غالب کو) اس کا جواب نہیں ملا۔
- ۴۔ فاریں ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم کی چٹھی مورخہ ۹ نومبر ۱۸۴۴ء
کورٹ آف ڈائریکٹرز کے یہاں سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا اور یہ کہ ان کی موجودہ درخواست کی ایک نقل ان کے (کورٹ آف ڈائریکٹرز) پاس بھیج دی جائے گی۔

غالب کا پنشن کیس

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۸۱۲ - ۸۱۳

۲۹۱ - ۲۹۳

- ۱۔ غالب کی چٹھی بنام سٹرائٹ ووڈ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔
اس ملاقات کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ان سے دہلی میں ہوئی تھی اور مزاج پرسی کی
گئی ہے۔

۲۔ غالب کی جنم بنام سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔

گورنر جنرل کے ملاحظے کے لیے اپنی درخواست کو ملفوظ کیا ہے اور یہ امید کی گئی ہے کہ ان پر وہی کرم فرمائی جا رہی رہے گی جو مکتوب الید کے پیشروؤں سوشلٹن پر فییب اسٹرنگ میکناٹن اور سیڈوک نے مبذول فرمائی تھی۔

۳۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ ڈالین براگورنر جنرل۔

معرض ہے کہ گورنر جنرل کے دورہ الہ آباد کے موقع پر انھیں (غالب کو) بتایا گیا تھا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرس نے گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلے کو بحال رکھا ہے اس پر انھوں نے (غالب نے) ایک اور اپیل ہرجبشی ملکہ مغلفہ کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ ۵ راکست کو سائل کو مطلع کیا گیا کہ ان کا معاملہ انگلستان بھیج دیا گیا ہے۔ اسے ۱۸ جینے گزر گئے لیکن انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ اس درخواست پر ۲۶ جنوری ۱۸۴۳ء کی تاریخ پڑی ہے۔

۴۔ سکریٹری گورنر جنرل کی جنم مورخہ ۵ راکست ۱۸۴۲ء

اطلاع دی گئی ہے کہ غالب کی یادداشت اگلی ڈاک کے ذریعہ کورٹ آف ڈائریکٹرس کے پاس بھیج دی جائے گی۔

۵۔ مسٹر آئی کری سکریٹری گورنر جنرل کی جنم مورخہ ۲ فروری ۱۸۴۲ء

اطلاع دی گئی ہے کہ ہنوز انگلستان کی سرکار کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ غالب نے ان دونوں مذکورہ الصدہ چٹھیوں کی نقول اپنی درخواست مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۴۳ء بخدمت گورنر جنرل کے ساتھ ملفوظ کر دی تھی۔

غالب کا پنشن کیس

۸۱۵ - ۱۶

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

فاری ۱۸۵۶ ڈپارٹمنٹ پریٹیکل

۱۹ دسمبر نمبر ۸۳ - ۵

۱۔ تحریر مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۵۶ء بنام بی بی ایڈمنٹن۔ سکریٹری گورنر جنرل

آف انڈیا با جلاس کونسل فورٹ ولیم۔

ملفوف درخواست اور مسئلہ کاغذات پیش کرتے ہوئے غالب التماس کرتے ہیں کہ انھیں گورنر جنرل کے ملاحظے کے واسطے پیش کر دیا جائے اور ازراہ نوازش اس کی غالب کو اطلاع دی جائے۔

تجید اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونگ سونا

مقدم ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۲۔ درخواست بخدمت جان وائیکانٹ کی جنگ گورنر جنرل با جلاس کونسل۔

غالب سر جارج کلرک کی ایک چٹھی اپنی درخواست کے ہمراہ ملفوف کرتے ہوئے اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ان کا معاملہ ہر مجبئی ملکہ منظمہ کی خدمت میں، ۱۸ مئی ۱۸۵۶ء کو ارسال کر دیا گیا ہے جیسا کہ انھیں اطلاع دی گئی تھی۔

عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونگ سونا

معرضہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۳۔ نقل حکم گورنر جنرل

اس کے ہمراہ جارج کلرک کی چٹھی کو واپس کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ جب کورٹ آف ڈائریکٹرس کا فیصلہ وصول ہوگا ۱۰ اس سے غالب کو مطلع کیا جائے گا۔

غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات

حضرت غمگین کے ناہر

مرزا غالب کے مکتوب الہم میں حضرت غمگین کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غالب نے ان کی رباعیات کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ذوق کو آفتاب اور کوئی میں دریا کو بند کر دیا ہے اور ان کے دیوانہ رباعیات پر وہ مطالب پوشیدہ پس جو غمگین مولانا روم میں بھی نہیں ملے۔ ان رباعیات کا خطی نسخہ مکاشفات الاسرارؒ انڈیا آفس لاہور میں لندن میں موجود ہے۔ بلورم مارٹ نے اس کا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے:

”یہ نیر علی دہلوی المعروف یہ حضرت جمی التخلی غمگین کی مکتوبات اور رباعیات کا دیوان ہے۔ اس کے فارسی مقدمہ میں مصنف نے اپنے محالات لکھے ہیں جن کی ابتدا انہ آدودا شعار سے موفی ہے۔“

لے رقعات غالب و غمگین (تخلی غمگین) اکادمی گوالیار خط نمبر ۱
 ۱۵ مکاشفات الاسرارؒ انڈیا آفس لاہور میں لندن قبر آدود ۱۵
 ۱۵ نیرت جدو تانی خطوط انڈیا آفس لاہور بلورم مارٹ میں ۱۹۱۹ء مطبوعہ ۱۹۱۹ء نیر مکاشفات الاسرارؒ نسخہ لندن
 ورنہ کتاب۔

ایک عمر ہی میری اللہ کی جنگ دیتا ہے اور شکست سو سو جنگ
 غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا نہ فوج رہی نہ میں نہ دو نام و ننگ
 فارسی مقدمے کی ابتدا کے الفاظ یہ ہیں :

”حامد بعد حمد حقیقت و نعت صورت خود، سید علی عرف حضرت جی مخلص
 غمگین منوطن و ملی قادری نقشبندی ابو العلاء المشرب، جملہ احوال خود
 بغرض احباب صفوت انساب میں رسالہ۔“

شروع کی رباعیوں میں بسم اللہ کی تفسیر ہے۔ ابتدا کا شعر ہے :

بسم اللہ میں سب ہے جو کہ قرآن میں ہے

قرآن میں وہ ہے جو کہ انسان میں ہے

(حضرت) سید ظلی دہلوی گوالیار کے ساکن تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد تھا۔ جو
 دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین احمد قادری (تلمیذ غمگین) کے بھتیجے تھے غمگین کے والد کا
 انتقال اس وقت ہوا جب اول الذکر کی عمر بارہ برس کی تھی۔ ۲۵ برس کی عمر میں درویشی
 اختیار کی اور سید فتح علی رضوی سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد گوالیار سے پٹنہ اور پٹنہ
 سے گویا کا سفر کیا۔ گیا میں ان کو حضرت شاہ ابراہیم کات کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔
 جن کے مشورے سے وہ بارہ برس تک پٹنہ میں رہے۔ یہاں انھوں نے خواجہ ابوالحسن
 سے فیض باطنی حاصل کیا اور ان کے ملتہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ حضرت غمگین نے
 خواجہ ابوالحسن اور سید فتح علی دونوں کے سلسلے بھی بیان کیے ہیں :

”مکاشفات الاسرار کا یہ دیباچہ برہان پور میں لکھا گیا تھا حاجب غمگین کی

عمر ساٹھ برس کی تھی۔ اس کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس سے

قبل وہ ایک دیوان مرتب کر چکے تھے جس میں ان کی زندگیاں کے کچھ حالات

درج ہیں۔ اسی کے بعض اشعار دیوان مکاشفات الاسرار میں شامل کر دیے

ہیں جو انھوں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ

نسخہ مصنف کا و تحفہ معلوم ہوتا ہے۔

یہاں جہنم ہارت نے غالب پر ڈیڑھ سطری حاشیے میں دو قاحش غلطیاں کی ہیں۔
 لکھا ہے کہ ان کا انتقال کلکتہ میں ۱۷۲۷ء ۱۸۰۶ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں
 صحیح نہیں۔

مکاشفات الاسرار میں حضرت غلگین نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لیے
 دیباچہ اہمیت سے خالی نہیں۔ یہاں اس کے چند اہم حصے نقل کیے جاتے ہیں :

"جملہ اذ احوال خود بفرض احباب صفوت انساب می رساند کہ ایس فقیر ابن
 سید محمد بن سید احمد سید شاہ پیر بن سید محی الدین بن سید شیر محمد القادری کہ
 در برہان پور آسودہ اند و زیارت گاہ خلعت اند از اولاد سید محی الدین عبدالقادر
 جیلانی^۱ است جنی اللہ تعالیٰ عنہ و رحمۃ اللہ علیہم اجمعین و جدہ تفسیر
 بہت خواجہ الہی بن خواجہ بہاؤ الدین بن خواجہ عبداللہ المشہر بہ خواجہ
 نورہ محقق ابن خواجہ باقی باللہ الحنفی المتخلص بہ بیزنگ قدس اللہ سرہ اہم است
 کہ در وہلی زیارت گاہ خلعت اند فقیر دوازدہ سال بود کہ والدہم بعالم
 بقا رحلت فرمودہ بودند و گاہ گاہ ایس خیال می آمد کہ از کسے دوست حق
 بہ پیوندم تعلیم راہ حق از و حاصل نمایم۔ چوں بہ عمر بست و پنج سالگی
 رسیدم تحصیل علوم مشغولی در زیدم و حنیکہ عمر بہ بست و نہد سالگی رسید
 شے در خواب دیدم کہ شخصی می گوید کہ ترا علم تو سید شاہ نظام الدین احمد
 قادری رحمۃ اللہ علیہ طلبند"

اس خواب کی تعبیر حضرت فتح علی شاہ گرویزی نے بیان کی اور فرمایا :

"کہ تعبیر ایس خواب بہین است کہ ترا مبارکباد بہ روز جمعہ پیش ما آئی۔

پس روز جمعہ حسب ارشاد رسیدم و از دولت بہیت و ریتہ فائز گشتم"

میر فتح علی شاہ کی ہدایت کے مطابق غلگین پٹنہ میں حضرت خواجہ ابوالبرکات کی خدمت

لے مکاشفات الاسرار نسخہ لندن - دیباچہ

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ سندھیا مولفہ ابو رکن محمد اس۔ مطبوعہ مطبع مطہرہ عام لاہور ۱۹۰۷ء
 ص ۱۰۹

میں حاضر ہوئے اور انھوں نے چلتے وقت دو سلسلوں کی اجازت دی :
 " وقت رخصت مرا اجازت دو سلسلہ کے قادریہ و دیگر چشتیہ عطا فرمودند
 بعد ازاں فقیر در بلدہ گویا رچند سال در صحبت آں بزرگواران فائدہ ما
 ربوود "

اس دیباچے سے حضرت عکیم کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے :
 " از زمان سابق دیوان ریختہ گفتہ بودم آں را دور کردم و الحال کہ عسرہ
 شصت سالگی رسیدہ آنچہ کہ واردات ہرمن غالب بودند موافق آں ما
 دیوان دیگر در حالات و واردات و ذوق و شوق تحقیق و مجازی خود
 ترتیب دادم و بعضی غزلیات مخصوصہ دیوان سابق دریں دیوان
 لاحق مندرج ساختم و چون دیوان نو بہ اتمام رسید و واردات و
 غلبات و کیفیات بروم استیلا داشت خواستم کہ برائے برادر دینی
 عزیز از جان اسد اللہ خاں میرزا نوشہ متخلص بہ غالب واسد کہ دین
 زمانہ در نظم و نثر نظیر خود ندارند ترتیب دہم "

حضرت عکیم نے مکاشفات الاسرار کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام مراتب حقیقت
 ہے۔ اس کی "شان نزول" یہ ہے :

" یک روز در باغہ نشستہ بودم کہ ہمارا جہ عالی جاہ بہادر (دولت
 راؤ متدھیا) برائے آں جناب (خواجہ ابوالحسن) تیار کنایہ سندہ بود ،
 سخن (خواجہ ابوالحسن) فرمودند۔ کمال باریک ۔ و از حاضران فرمودند کہ
 معنی ایں بیان کنید ، باریک از یاراں موافق استعداد خود عرض نمود۔
 فقیر را ہم گفتند کہ تو ہم چیزے بگو۔ من ہم موافق استعداد خود عرض نمودم۔
 دیدم کہ بہ چہرہ مبارکش بشارتے پیدا آمدہ بعد پنج سال اسرار ما در دل
 فقیر جوش آوردند کہ طاقت تحمل نہانہ ناچار یک دیوان ہفت قصیدہ غزل گفتہ
 بائے قدرے تسکین حاصل شد۔ باز اسرار ما در دل پیدا آمدن گرفتند۔

باز یک دیوانہ ربا حیات قریب ایک مزار و مہشتا قصہ رباعی گفتہ شد و چند روز خاموش ماند۔ بعد دوسرے سال بار اسرار با جوش آوردند و دوستان من نیز گفتند کہ (کسے) کتاب نشر باید گفت (؟) کہ اسرار و مسائل تصوف واضح شوند و بہ آسانی در فہم آیند و نام آں دوستان در دیباچہ نوشتہ ام۔ پس اس کتاب نوشتہ شد۔ اس سہ از برکت زبان مبارک آں جناب است والا من آن کہ من دانم علیہ السلام

حضرت عکاتین نے ایک کتاب فتنل و اشغال میں بھی لکھی ہے جو ارشاد الحسینی کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے کہ حضرت سید فتح علی گریزی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام جو اہر فیض ہے۔ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

"می گوید فقیر حقیر.... شرف اندوز پا بوس مخدومی سیدی.... فتح علی حسینی الرضوی الکر ویزی ثم الشاہ جہاں آبادی دام ظلہ.... شدم و بیعت نمود۔ شب و روز در خدمت شریف حاضری بودم و جارب کشی آستانہ متبرک می کردم.... و در عرصہ سی و یک سال آں چہ از زبان و درفش ارشاد می شد آں را در صدف سینہ نگاہ می داشتم و می سپردم و طریزہ حافظہ اذکار و اشغال و مراقبہ و مشاہدہ و لطائف و مقامات و غیرہ علیہ السلام

حضرت عکاتین کے حالات ان کی تصانیف کے علاوہ دوسرے بزرگوں کی ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔ کیفیت العارفین میں لکھا ہے :

"چوں حضرت قطب العاشقین (حضرت ابوالبرکات) ہجوم خلایق بہ خود دیدند، و رآں زباں اکثر طالباں را در راجہ تریبیت یافتن باطن تفریض خلقت الرشید خود حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ می نمود چنانچہ در آں روز سید علی شاد از گواہی ارباب نعمت باطنیہ گشتہ بہ خدمت

۱۷ مرات حقیقت اعلیٰ تسو ملوک عکاتین اکادمی گواہیاد، ورق ۳۹

۱۷ جواہر فیض (۱) دیباچہ عکاتین اکادمی گواہیاد۔ اس کتاب کا مادہ تاریخ "غریب" ہے جس سے

حضرت قطب العاشقین آمدہ تربیت یافتہ، مشرف از خلافت از خواجہ
ابوالحسن صاحب، گزیدہ مراجعت بہ سمت گوالیار کردہ۔ آں جا بعد
از دو سال حسب استدعای راجہ دولت راؤ سندھیامع اخراجات
جہت رونق افروزی حضرت قطب العاشقین در شہر عظیم آباد آمدند و
برائے تشریف بری آں حضرت تذکرہ آوردند۔ از آں جا کہ حضرت
قطب العاشقین را رغبت حشم و خدم و مرزاج یمن نہ بود۔ از آں جا
صدائے نہ برخاست۔ الا خلف الرشید آں حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب
ایں امر را قبول نمودند.... وقتیکہ خواجہ ابوالحسن صاحب در گوالیار
رسیدہ.... متعلقان را نیز از شہر عظیم آباد طلبیدند۔ بعد از دو سال
حضرت قطب العاشقین نیز کہ خلف الرشید خود را از دیگر فرزندان عزیز تر
داشتند تاب مفارقت نیاوردہ.... خود مع دیگر لواحقان عزم
سفر سمت گوالیار برداشتند۔

یہ ماخذ سوانح غلیقین کے سلسلے میں اہم ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو
تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات نجم الدین اکادمی میں ایک وظیفے کی
کتاب ہے اس میں حافظہ بنیاد عبدالرزاق عروت میاں میرزا علی المتخلص بہ رزاق کے
قلم سے حضرت غلیقین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۹۶ھ (۶۱۴۵۳) اور تاریخ وفات
۳ صفر ۱۲۶۸ھ (۶۱۸۵۱) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وہ سابقہ بیانات کی رو سے
۲۹ سال کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ/۶۱۴۴ء میں بیعت ہوئے اور ان کی نشی ادبی زندگی کا
آغاز ۹۰ سال کی عمر یعنی ۱۲۲۴ھ (۶۱۸۱۲) میں ہوا۔

غلیقین کی وفات پر نواب مصطفیٰ خاں شہقہ نے ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے رزاق

کی تصدیق ہوتی ہے :

بدعت حضرت غمگین تخلص	شدہ سید علی حسنہ رانی
بہ صورت سالک راہ طریقت	پہ معنی شاہ ملک کام رانی
بدیدہ محو دیدار حسدا بود	پہ دل آگہ ز اسرار نہبانی
بطولش دیدہ کمال بصیرت	طہورش سر نہ چشم معانی
دلش چوں یافت ذوق رب ارنی	خطاب آمد کہ تو در خود نمائی
بہ یک شنبہ سوم روز صفر شد	کلیم آسا بہ زیر کوه فانی
ز دل آہے کشیدہ شیفہ گفت	بہ برو او را صدائے لن ترانی

۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء

غمگین کا ذکر بعض تذکروں میں بھی ہے۔ عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) میں لکھا ہے :
 ”غمگین تخلص۔ میر سید علی خلیف الرشید میر سید محمد مرحوم برادر زادہ حقائق و
 معارف آگاہ سید شاہ نظام الدین احمد قادری، ناظم صوبہ دارالاحسن لافہ۔
 تشریح بزرگی حسب و نسب محتاج بہ تحریر نیست۔ مرد بامروت و قابل
 است۔ از تصانیف اوست :

تو نے صیاد دنیا ظلم یہ ایجا د کیا بال و پر تو رقص سے مجھے آزاد کیا

ترے ثانی اگر کوئی بشر ہو دے تو میں جانوں

بشر تو کیا اگر شمس و قمر ہو دے تو میں جانوں

ہجر میں اس کے دل جینے سے میرا میرے لے اے جل بہر خد آجلد اب کیا دیر ہے

دل اس کو دیا اب کیا تدبیر سے ہوتا ہے

جو کام کہ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے

سوائے تیرے نہیں کوئی یار انگوں میں پھرے ہے تو ہی تو لیل نہارا انگوں میں

نے چٹکریہ پیر زادہ دانش میاں سید رضا محمد صاحب حضرت جی۔

نہ عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) عکس نسخہ اندازا آئینہ ورق ۲۹۲

مہرباں کوئی مرا جز عشم و لہار نہیں
 خُش کا شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں
 مڑگاں کہے ہے اس کا گزیر بے تو میں ہیں
 اور دل کہے ہے میرا بھیر بے تو میں ہوں
 عشق میں رو رو کے جو یہ داغ دلِ حوق ہے شمع
 رشتہ الفت کو پروانے سے کیوں کھوئی ہے شمع
 بلبل ہے اگر بہار سے خوش ہم اپنے ہیں گلِ خزار سے خوش
 دل کے نگ جانے کا یاروں سے کہوں کیا باعث
 ایک قصہ ہے جو ناحق میں کہوں کیا باعث
 عاشق ہوا ہے میرا یہ دل اس کی آن پر
 اند کیسی آن بنی مسیری جان پر
 اس ابر میں سے چٹا ستوں کو جواز آیا

ساقی مع سے آیا مطرب مع ساز آیا
 عیار اشعار میں خوب چند دکھانے لکھا ہے !
 ”میرزا علی گلیں جو ان گرم اختلاط و خوش خلق و شگفتہ بیان سعادت
 آفتاب، ستورہ اخوار، پر عظم و جیا معلوم شد۔ بہ اصلاح سعادت یارِ خاں
 رنگین نگاہ اے اشعارِ آب و آرد و رازِ گاہ و ہوس تازہ بخندہ ہمسگی
 دیوان معروف و نظر ایں نفیر انواع المعانی در آمدہ“

اس کے بعد نمونہ یہ سات شعر دیے ہیں :
 مرا اس عشق کی دوست سے چہرہ ارغوانی ہے
 نکلتا ہے جواشک آنکھوں سے میرا ارغوانی ہے
 میرے عیا و نیا ظلم یہ اسبا و کیسا
 بال و پر تو دقفس سے بکھے آزاد کیا

اے عیار اشعار، کس مخطوطہ لندن۔

دریں کوئی مزاج غم و لہر نہیں خسر کا شے کے سوا کوئی خرید نہیں

یہ داغ عشق نہ ہو دور اپنے سینے سے
کہیں شاہے کداحرث بھی بیگنے سے
گو یہ بخت ہوا پر سر نہ بنائی ہوں جو کہ دیکھے ہے سوا نکھوں کے گلاب ہے مجھے
مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا
آخر اس شوخ نے جبا مارا
ایک مدت رہے (ہم) عشق بتاں میں غمگین

بعد ازاں کعبہ کو بھی کر کے سمنہ دیکھ لیا
سرور اور دکا کے تذکروں میں جن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے وہ موجود دیوان غمگین
میں نہیں ہیں۔ اس لیے قرینہ غالب ہے کہ یہ اشعار اس دیوان اول کے ہیں جو ۱۷۹۰ء سے
پہلے ترتیب دیا گیا تھا اور جو بیعت کے بعد غمگین نے خود ہی مسترود کر دیا تھا۔

غمگین کا ذکر مجوزہ لغز میں بھی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دل چسپی سے خالی نہ ہو گا :
”غمگین تخلص... جو نے نیک زندگانی، کشادہ پیشانی، خوش اخلاق مستحکم
ارتباط، یار ایش، محبت تلاش، تخلص نواز، مخالف گداز، باعزت و تکین شاگرد
سعادت، بارخاں رنگین است، نلی قدر حال خط فسق، کذا، ہی نوید و کم کم
فکر سخن می گزید۔ خوش زندگانی می کند و با فرح و سرور، ایام بے بدل جوانی
بکام دل بسر می برد۔ بہر حال اس چار بیت منسوب بدوست :

(۱) میرے صیاد نے کیا ظلم الخ

(۲) یہ داغ عشق نہ ہو دور الخ

(۳) میرا اس عشق کی دولت سے

(۴) گو یہ بخت ہوں پر سر نہ بنائی ہوں

جو کہ دیکھے ہے سوا نکھوں سے لگا تب مجھے

اس شعر سر قہا اب کلیم است۔ اما بہ زبان خود خوب غفرت لے

جاس رنگین میں غمگین کا ذکر درجہ آیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے غمگین کو اپنا شاگرد لکھا ہے اور اپنی وہ غزل وی ہے (مان کر۔ جان کر) جو انھوں نے جرات کی زمین میں غمگین کی فرائش پر فی البدیہہ کہی تھی۔ دوسرے موقع پر غمگین کے اس شعر نقل کیے ہیں جو انھوں نے ڈھاکہ میں چند دوستوں کے سامنے اور ایک کشمی کی سواری کے دوران میں پڑھے تھے۔ غمگین نے بھی رنگین کی اسادی کا اعتراف کیا ہے قطعہ تاریخ میں لکھا ہے :

جب استاد رنگیں جہاں سے گئے تو ایک یادگاری رہی رنجی
خود نے کہا یہ ہی تاریخ ہے کہ ساتھ ان کے غمگین گئی رنجی

۱۲۵۱ء / ۱۸۳۵ء

غمگین کا ترجمہ کریم الدین، نسخہ، شیفٹہ اور عبدالحی صفائی بھی دیاتے ہیں لیکن کوئی نئی یا خاص بات نہیں لکھی۔ سید فتح علی گروہری کے تذکرہ ریختہ گویاں میں انھانوسے شعرا کا ذکر ہے لیکن غمگین کا ذکر نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مؤرخانہ ذکر کا شمار استادوں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ نواب الہی بخش خاں معروف نے بھی غمگین سے مشورہ سخن کیا تھا۔

۱۔ جاس رنگین : نظای پر میں لکھنؤ ص ۱۰

۲۔ جاس رنگین ص ۳۲

۳۔ مخزن الاسرار علی : غمگین اکادمی گوالیار

۴۔ تذکرہ کریم الدین، ص ۱۹۰ و ۱۹۱ (طبقات دوم) طبع دہلی - ۱۹۳۵ء

۵۔ نسخہ سخن شعرا، ص ۳۵۳، مطبع نول کشور

۶۔ شیفٹہ : گلشن ہے غار، ص ۱۳۴، مطبع نول کشور

۷۔ صفحہ، شمیم سخن، ص ۱۰۷، مطبع امداد الہند، امرات آباد

۸۔ تذکرہ ریختہ گویان، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحی، مطبوعہ اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

۹۔ مقدمہ دیوان ذوق، محمد حسین آزاد

غالب کا سکہ شعر

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مرزا غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ ”باغیوں“ سے اخلاص رکھتے تھے اور انھوں نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کے اعلان پر جو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا، ایک سکہ شعر بھی کہا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے ایک خط میں کیا ہے جو حسین مرزا کے نام ہے اور ۸ مارچ ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے :

”اب میرا دکھ سنو، بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں کسی طرح کی بے وفائی و نہک حرمانی کا دھتیا بھر کو نہیں نکلا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوہریاں یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ غلامی تاریخ احمد شاہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزر دیا ہے۔“

یہ زور دے کہ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی مجھے جزا ملاقات صاحب کشتی نے پوچھا کہ یہ کیا لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ غلط لکھا ہے۔ بادشاہ شاعر بادشاہ کے بیٹے شاعر بادشاہ کے نوکر شاعر

خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ چاہیے حکیم حسن انصاری سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپ بورڈ۔ ۱۰۔ جو اس کی جلی ہوئی تو جانے سے وہ جتنے پہلے ایک فارسی رو بکار لکھوا لیا کہ یہ جو اسد انصاری خاں فارسی کے علم میں یکا چشمہ ور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا، ہمارے نزدیک پٹن کے پانے کا مستحق نہیں ہے....

یوسف مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی یہاں منشی میرا محمد حسین ولد روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا، ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مرید، بھائی اتر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ چھپائی تھی، وہاں اس سکہ کا گزرتا قذوقی کا رلٹ سے چھاپا تھا۔ اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے پہلے ۱۲۵۳ھ یا ۱۲۵۴ھ میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں، اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ اخبار اصل مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کر دوں گے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) جو سکہ غالب سے منسوب کیا گیا وہ یہ ہے۔

بہ زرد سکہ اکثر سستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

(۲) غالب اس کی تصنیف کے منکر ہیں اور اسے قذوقی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

(۳) غالب کے خیال میں یہ سکہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت ۱۲۵۳ھ یا ۱۲۵۴ھ میں کہا گیا تھا۔ یہ مرشد آباد کا سکہ شہور تھا اور دہلی اور اخبار میں چھپ چکا تھا۔

اسی لیے غالب کو اس اخبار کی تلاش تھی، چوہدری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں،

۱۹۴۰-۴۱ء

جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاٹ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں، تفصیل یہ کہ مولوی باقر و ملوی کے مصلح میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا ہے، سبھی یہ دہلی اور دو اخبار۔ بعض اشخاص سین ماہیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر اچھا نا آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۵۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھئے جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکتے ان کے نام کے کہہ کر پتہ کر کے کا ذکر مندرج ہوئے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل مجنس میرے پاس بھیج دیجئے گا۔

چودھری عبدالغفور اس پرچے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کو لکھتے ہیں: "آپ کی سہمی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دانشیں اور خاطر نشان ہے جیسا کہ کوئی استناد کہتا ہے۔"

تجس و ستا جنت، راجہ سودا زربکھل کو خضر آباد چوں تشریف آرد سکندرا وہ اخبار کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا۔ میں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اس کے نکل جائے گا۔

اگلے خط میں پھر اسی کا ذکر ہے اور اس کا افسوس ہے کہ یہ الزام کی طرح دور نہ ہو سکا، "سکے کا دار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب، کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکتے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکتے کہہ کر گزارنے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے مستقرین میں تھے، انھوں نے دلی آردو اخبار میں یہ دونوں سکتے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکتے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔"

اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرائے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلم و ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ دھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ فیشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مشاخیہ پر ہوا چونکہ موافقِ رضا الہی ہے، اس کا گلہ کیا ہے چوں جنبشِ سپہرہ فرمانِ دادِ راست بیدار و نمود آنچسہ بہا آسماں دہرہؑ

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

"وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے اور خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سگ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ مسکدہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بار وہ بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا ٹوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوںؑ

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ "وہ مصرع" کون سے تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ جو سکے غالب کے نام سے مشہور ہوئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سگ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزرا تھا، اس طرح "باغیوں سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ جو سگ میں نے دریافت کیا ہے وہ غالب کے انکار کی بنیاد نہیں ہے اور نہ وہ ان کے کسی خط میں معرضِ بحث میں آیا ہے۔

معین الدین حسن خاں نے خدنگِ خدر میں لکھا ہے کہ کھنڈ سے مرزا عباس نزد

لے اردو سے ملے، مطبوعہ ۱۸۹۵ء، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

سے خطوطِ غالب مرتبہ مولوی ہمیش پرشاد، ص ۱۵۶۔

سے عکس ملو کہ راقم۔ یہ کتاب شبنم اردو، دہلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے

لائے، جس میں بادشاہ کے نام کی اشرفیاں تھیں اور جن پر یہ شعر کندا ہوا تھا :

بہ زرد سکہ نصرت طرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی

یہاں ایک جملہ معترضہ ضروری ہے، مشکات نے خدنگ ندر کے انگریزی ترجمے میں سورج الدین لکھا ہے، اس کے علاوہ اس میں ترجمے کی بے شمار غلطیاں ہیں، خواجہ حسن نظامی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروایا ہے اور اصل متن نہیں دیکھا۔ مشکات کا ترجمہ غلط اور خواجہ حسن نظامی مرحوم کا غلط اور غلط ہے۔

ممکن ہے یہ سکہ (بہ زرد سکہ کشورستانی یا سراج الدین بہادر شاہ ثانی) بہادر شاہ کی تخت نشینی (۱۷۵۳ء) کے وقت کا ہو اور بعد میں "کشورستانی" کے بجائے نصرت طرازی اور "ثانی" کے بجائے غازی کے الفاظ سنہ ستاون کی جہد آزادی کے پیش نظر بدل دیے گئے ہوں۔ اس میں اور غالب کے نقل کردہ سکہ میں اصل فرق یہی ہے، اس کا مصنف کون ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے، لیکن جیون لال معین الدین جن خاں دونوں نے اسے ایک ہی طرح لکھا ہے اور کسی نے اسے غالب سے منسوب نہیں کیا، پوری خدنگ ندر میں صرف ایک جگہ غالب کا ذکر ہے، وہ بھی ان کے بھائی کے ذیل میں بنگالہ جرنیلی کے سیکلے میں لکھتے ہیں :

"محلہ کھڑکی فراش خانہ میں مولوی فرید الدین صبح کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد میں ملے گئے، حکیم جنی الدین خاں و حکیم احمد حسین خاں بھی اسی طرح مع اپنے قاتلوں کے ملک، عدم کو دست و گریبان روانہ ہوئے، مرزا یوسف برادر خورد اسد اللہ خاں غالب کہ قدیم سے جمنون تھے، حالت جمنون میں مگر سے باہر محل کے ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے اور کئی آدمی آبر (و) دار، نامی اس بنگالہ جرنیلی میں معرض قتل میں آگئے۔"

۱۷ TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI
TRANSLATED BY G.T. METCALFE, 1876, PAGE 87.

۱۸ قندک صبح و شام، مطبوعہ سہرورد پریس، دہلی (۱۹۲۶ء) مرتبہ مولوی ضیاء الدین برنی
۱۹ خدنگ ندر، خطوط، بقلم مصنف، دہلی ۱۱۰۴ الف، عکس ملو کہ راقم۔

مشکات نے جیون لال کے روزنامے کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بھی بہت سی فاحش غلطیاں ہیں۔ اس ترجمے میں غالب کا سکہ نذر ہے لیکن اصل روزنامے میں موجود ہے۔

نشی جیون لال کے الفاظ یہ ہیں :

”انیسویں مئی ۱۸۵۷ء“

دربار شاہی منعقد ہوا مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکہ جلوس
در بابت تخت نشینی حضور گزرانا۔ سکہ شعر :

سکہ زہریم دزد در بند شاہ دیں پناہ نقلی بھانی سراج الدین بہادر شاہ (کذا)
اس پر اور شاعروں نے بھی سکہ کہے۔ سکہ شعر :

سکہ صاحب قرانی زد بتائیم الہ سائے یزداں سراج الدین بہادر شاہ (کذا)
(ورق ۳۸ ب) دیگر سکہ شعر :

سکہ صاحب قرانی زد بتائیم الہ نقلی بھانی سراج الدین بہادر شاہ
دیگر سکہ شعر :

بزرزد سکہ نصرت طرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی
دیگر سکہ شعر۔ مرزا نوشہ ۵

بزرزد آفتاب و نعت سداۃ ماہ سکہ زہریم دزد در بند شاہ ۶

مشکات نے اس عبارت کا ترجمہ کہ ”مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکہ جلوس در بابت تخت نشینی حضور گزرانا۔ ۱۶“ اس طرح کیا ہے۔ اصل کے ساتھ بقول اہالیوں کے خداری ہے۔

لے جیون لال روزنامہ آئندہ نقلی کس ملوک راقم۔ ۱۷ روزنامہ نشی جیون لال اصل مسودہ ملوک مشکات ورق ۳۸
البت وہ کس ملوک راقم۔ ۱۸ مشکات نے یہ نظم نقل کی، چنانچہ لکائی ہے۔ ”سکہ جلوس ۱۰ اور دیگر سکہ شعر کا ترجمہ
منفک چیز ہے۔ اس سے سارا مفہوم بدل گیا ہے (مشکات کا ترجمہ ص ۹۹) خواجہ حسن نظامی نے تھانہ مولوی علی تھانہ دار
بھی حاضر تھے اور انھوں نے نذر کے طور پر چند اشرفیاں پیش کیں۔ سکہوں پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ سکہ زہریم دزد ۱۶۔
دوسری جانب حسب ذیل عبارت درج تھی ”سکہ صاحب قرانی ۱۷“ علامہ جوہر نے کی مسجد و شام ص ۱۱۳۔

MOLVI JAJJAR ALI (۲) THANADAR ATTENDED AND PRESENTED A SICCA OF GOLD MOHUR AS TRIBUTE MONEY. ON THE COINS WERE INSCRIBED ON THE REVERSE:

سکہ نذر ہر سیم و زر الا

سکہ صاحب قرائی نذر الا

خشی جیون لال کی روش غالب کے ساتھ معاونانہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ شعر ہے

بر نذر آفتاب و نصرتہ ماہ سکہ نذر در جہاں بہادر شاہ

خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب تک مختلف شاعروں کے ساتھ کئے گئے آئے ہیں لیکن اس قدر دلکش کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔

غالب نے ایک قصیدہ بھی اس نذرانے میں فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا، آگرے کے اخبار عالم تاب میں لکھا ہے کہ ”مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ مارچ

جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے تھے“ اس کی بھی تائید خشی جیون لال کے روزنامے سے ہوتی ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

(فتح آگرہ کے مزے سے سب بادشاہ و اہل قلعہ خوش تھے) مرزا نوشہ اور

مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود بادشاہ کی مدح میں پڑھے۔

غالب کے ایک شاگرد — مولانا بیدل

مرا وہ مولانا عبدالمصمیم بیدل سے۔ ملائذہ غالب میں ان کا سرسری ذکر ہے۔ اس ترجمہ میں نہ تو ان کی پوری تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کی کوئی غزل درج کی گئی ہے بلکہ حالات کہ غالب سے ان کے معنوی تعلق کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ ملائذہ غالب کی یہ بات بھی قریب صحت نہیں کہ بیدل کی ”نور ایمان“ میں ”مسائل دینی“ نظم کیے گئے ہیں (یہ دراصل نعت شریفین میں ایک رسالہ ہے جس کا دیباچہ شعر میں اور اصل رسالہ نظم میں ہے)۔ یہ اطلاع بھی صحیح نہیں کہ نور ایمان کے دیباچے میں عبدالمصمیم بیدل کے یہ اشعار ”دوستو ہے دارفانی چند روز“ درج کیے گئے ہیں۔ ہمارے سامنے نور ایمان کا وہ نسخہ ہے جو شرف المطالع میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ اشعار کہیں بھی موجود نہیں۔ اور دیباچہ تو ازاول تا آخر شعر میں ہے۔ اس میں ایک مصرع بھی نہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن بھی ترمیم کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ ان وجوہ سے لگتا ہے

ملائے غالب

ملائے غالب

ص ۵۲

ملائے نور ایمان مطبوعہ شرف المطالع - میرٹھ ص ۵۵ (مستند)

ہوتا ہے کہ صاحب تلامذہ غالب نے نور ایمان کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ کسی اور ذیلیے سے معلومات اخذ کی ہیں۔ ورنہ وہ اس کے مندرجات سے جس صحیح طور پر مطلع فرماتے اور اس کے صفحہ مطبع اور ایڈیشن کسی چیز کا تو حوالہ دیتے۔ اس کے علاوہ مولف موصوف و عبدالمسیح بیدل کی کلہم دو کتابوں کو "موجود" بتاتے ہیں، حالانکہ اس وقت ان کی دس تصانیف ہمارے سامنے موجود ہیں جو محب مکرم جتیا شمس الدین صاحب رئیس میرٹھ کی مہربانی سے حاصل ہوئی ہیں۔ مؤرخ الذکر محمد دی خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم و مغفور کے چھبے نے صاحبزادی ہیں اور خان بہادر صاحب، بیدل کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ گویا شاگردی کے لحاظ سے غالب کے پوتے تھے۔

نور ایمان کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

"عبدالمسیح بیدل اور اللہ رسول کی صفات! وہی خصل ہے چھوٹا سمندر بڑی بات۔ اس زبان کی شفت کو اس نام لطیف سے کیا مناسب۔ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت۔ بھلا جس کا بال بال غلطوں میں بہرا ہوا ہو۔ اس سے یہ پاک عمل سرسبز صواب کیونکر ہوا۔ لیکن کیا کیجیے چین نہیں پڑنا کہ یہ نام نہ لیجیے کبھی دل اور زبان کو اس نام سے تھل۔ یا جانتا ہے کہ لا الہ الا اللہ اور کبھی روح رواں کو اس نام سے تازہ کیا جاتا ہے کہ تَحْسَنُ رَسُوْلُ اللہ یا ہر پھر کر یہی دو نام۔ ان ہی دو کی اطاعت سے اہل ایمان کا حسن انجام۔"

مولانا بیدل ^{۱۲۵۵ھ} ۱۸۳۹ء میں شہر "جانبہ" آسائے راحت افزائے دہلی میں پیدا ہوئے اور علوم معقول و منقول صدر الدین آزاد اور دیگر اکابر علمائے دین سے حاصل کیے۔ خود لکھتے ہیں :

"اُن ایام میں بہ انقلاب عقائد شباب دل میں یہی ایک موج آئی کہ حساب نجم الدولہ و میر الملک اسد اللہ خاں خاتم عرف مرزا نوشہ، جلوی سے شعور میں اصلاح لینے شہر بنی۔ تب اہلہ عاشق و معشوق کے مضامین، مزید رسیا بنا، زماں کی طرز پر لکھنا

نہیں، وہ بیاض چوری عملی ہے۔

خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم نے جو کلام جمع کیا ہے وہ حضرت بیدل کی زندگی میں۔ اور اس مجموعے کے تیار کرنے میں ان لوگوں سے خاص طور پر مدد ملی ہے جن کو ان کا کلام یاد تھا۔ جو غزلیں ناقص ہیں ان کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔

طراز سخن ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ویسا ہے میں اس کا اعتراف ہے کہ اگرچہ موجودہ اردو شاعری "جدید تعلیم یافتہ طبائع" کے لیے "لطف انگیز" ہے لیکن بیدل کا کلام "عاشقانہ مضامین اور صنائعِ ہوائے" دونوں اعتبار سے "سر آنکھوں پر جگہ دینے کے" لائق ہے۔

دیوان کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

بنایا عشق نے دل آئینہ اسرارِ جاناں کا

مرا حال پریشاں رکس ہے زلفِ پریشاں کا

ذیل میں بیدل کے منتخب اشعار "طراز سخن" سے دیے جاتے ہیں:

آسمانِ راہ پر نہیں آتا	باز یہ فتنہ گر نہیں آتا
کوئی حسرت نہیں نکلتی ہائے	مدعا کوئی بر نہیں آتا
جم بھی پتھر کا دل بنا لیں گے	گر وہ سنگیں جگر نہیں آتا

موتی بھر لائی ہے یہ چاندی کی کشتی میں بہار

یا چنبیلی پر پردی ہے اوس دانہ دانہ رات

اس کے رخ سے صبح کا دھوکا نہ کھا مرے سحر

دیکھ زلفوں کو ابھی باقی ہے اسے دیوانہ رات

کٹ کے سراپنا گرا تو پائے قاتل پر گرا

تھا شہادت کے لیے یہ سجدہ شکرانہ رات

طراز سخن، ص ۳۳۔ شہ ایضاً، ص ۳۳۔

رات بیدل نے غزل اک اور بھی لکھی ہے گرم
شمع تھی بے تاب جس پر صورت پروانہ رات

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
دل دیا حق نے وہ کہ ہے بیتاب
یہاں تو یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
اپنے عاشق کی بے گلی مت پوچھ
شعلہ رو تیری گرم خونی سے
کون سا دل ہے جو کہاں نہیں
جان پر میری کیا عذاب نہیں
آنکھ وہ وی کہ جس کو خواب نہیں
وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
دن کو آرام، شب کو خواب نہیں
کون سا دل ہے جو کہاں نہیں
مختصر ہے یہ حال بیدل کا
تن میں طاق، جگر میں تاب نہیں

جب اس بت کی ترپھی نظر دیکھتے ہیں
وہ آویں نہ آویں، مگر خستیں ہم
وہ دیکھے، نہ دیکھے مگر ہم تو بیدل
زمانہ کو زیر و زبر دیکھتے ہیں
جو اپنی سی ہوتی ہیں کر دیکھتے ہیں
اسی کو بس آنکھوں پہر دیکھتے ہیں

بیدل میں کبھی کو چڑا دبسر میں نہ جاتا
لایا مجھے میرا دل بے تاب ادھر کو

گر مانگ لیا مانگ نے دل اور جب کہ کو
وہ آئے، یہ آئے، ابھی غائب ہیں نظر سے
کچھ شوق نہیں شعر و غزل سے مجھے بیدل
چوٹی نے یا گوندہ مرے تارِ نظر کو
ظالم تری شوخی نے کیا مات مشر کو
لے آتی ہے فرمایش احباب ادھر کو

دل چاک چاک ہو گیا تیغ ادا کے ساتھ
گر وصل بھی ہوا نہ ہوئیں بے حجابیاں
نکڑے جگر کے اوڑھ گئے، مشقِ جفا کے ساتھ
وہ جلد گر ادب لک گیا، بندِ قبا کے ساتھ

جب باغ باغ ہو کے وہ ہنسا ہے گلبدن بھڑتے ہیں بھول خندۂ خدا کے ساتھ
 گزرا نہ میرے قتل سے سب سرچنگ مرے منت کے ساتھ، بھرنے کے ساتھ، التہا کے ساتھ
 آجائے تو، تو جان پھر آجائے جسم میں مرکز بھی جی اوٹھوں تیر جی آواز نہ پا کے ساتھ
 دل کی جیٹ تلاش ہے پہلو میں دل کہاں
 بیدل تھا دِل تو گیا دِل بُرا کے ساتھ

اوٹھاتے ہیں وہ زرخ سے یوں نقاب آہستہ آہستہ
 چٹختے جیسے گہن سے مابستاب آہستہ آہستہ
 نہیں کچھ ایک دوساغر کہ خم کے خم اوٹ دیں گے
 پلاسے جا آہیں ساقی مشراب آہستہ آہستہ
 طراز سخن میں کچھ عیدیاں، پسیلیاں، قطعات تاریخ اور اشعار فنا ہی بھی
 شامل ہیں۔

- بیدل کی تصانیف جو ہمیں دستیاب ہو سکیں، ان کی تفصیل یہ ہے،
- ۱۔ نور ایمان۔ نعت شریف اور استخوان محفل میلاد میں۔ دوسرا چہ نشر میں ہے، باقی منظوم۔ مطبوعہ شرف المطابع میرٹھ۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۳ء) تعداد صفحات ۷۲۔
 - ۲۔ طلیٰ نہ سخن۔ (دیوان) محمود پریس میرٹھ۔ ۱۸۹۶ء۔ تعداد صفحات ۳۸۔
 - ۳۔ ساسبیل فی مولد ہادی اسبیل۔ قصیدہ نعتیہ۔ شرف المطابع میرٹھ۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۳ء) تعداد صفحات ۸

نمونہ ۱

اول میں وہ ہی ایک تھا، مولیٰ دوالی ایک تھا
 وہ ذی تجلی ایک تھا، وہ ستر معنی ایک تھا
 وہ گنج ہستی ایک تھا، وہ کنز معنی ایک تھا
 پیدا نہ کوئی ایک تھا، جز ذات رب ذوالمنن

کب تھی یہ بھوہوں کی بیک، کب تھی یہ کلیوں کی چنگ
 نرسر میں کب تھی یہ چمک، چمپا میں کب تھی یہ جھلک
 لالہ میں کب تھی یہ دمک، کانٹے سے تجھے گل بزرگ تک

معدوم تھے سب یک بیک، گل تھا نہ گلہن نے چمن

یہ قصیدہ بڑے والہانہ ذوق و شوق سے لکھا ہے اور اس میں تاودرا نکلائی کا پورا ثبوت

بہم پہنچا ہے۔

۳۔ مثنوی نصیب جوہر لطیف فی میلاد الحنیف - مطبع قاضی میرٹھ ۱۳۲۴ھ - تعداد صفحات ۱۲۔

۵۔ سہل یاری - بیان لغات میں منظوم رسالہ - مطبع لاشمی میرٹھ ۱۳۱۳ھ - تعداد

صفحات ۳۲۔ ابتدا،

سیل ہے رو اور نالا اسے دبیر

ندمی اور غاب اور تالاب آب گیر

۶۔ مظہر الحق - ارکان اسلام کے بیان میں منظوم رسالہ - تعداد صفحات ۲۲

اور تعداد اشعار ۲۹۰ - مطبع نامعلوم۔

۷۔ بہارِ جنت - (میلاد شریف) نثر اور نظم دونوں میں - مطبع محمدی کانپور ۱۳۱۰ھ۔

تعداد صفحات ۷۲۔

۸۔ راحة القلوب (نثر) - ذکرِ رسول اور فضائلِ محفلِ میلاد میں - مطبع مجتہائی دہلی

۱۳۱۰ھ - تعداد صفحات ۹۲۔

۹۔ دافع الادویام فی محفل خیر الانام - مولود شریف کے جواز اور مولانا اسماعیل شہید

کی ترویج میں ۳۸ صفحے کا رسالہ جو نظر اور نظم میں ملا کر لکھا گیا ہے - زیادہ تر دلائل

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی ہی سے دیے گئے ہیں۔

مطبوعہ مطبع چشمہ فیض ۱۲۹۶ھ

۱۰۔ انوارِ ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ - دہلی - علماء کے اعتراضات کا رد و سوال و

جواب کی فہم میں مطبوعہ مطبع دارالعلوم میرٹھ ۱۳۰۲ھ - تعداد صفحات ۲۲۰۔

عبد اسمع بیدل شیخ الہی بخش رئیس میرٹھ کے یہاں پر حیثیت معلم بارہ روپے ماہوار اور کھانے پر ملازم تھے۔ وہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا اور قبرستان موصوم شاہ ولایت میں دفن ہوئے۔ ان کے ایک صاحب زادے حکیم میاں محمد رحوم، حکیم عبد الحمید خاں دہلوی کے شاگرد اور میرٹھ کے مشہور طبیب تھے۔ معاصرین بیدل میں بیان یہ بذاتی اور شوکت میرٹھی معروف ہیں۔ امیر مینائی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ بعینہ شمس الدین کا بیان ہے کہ امیر کے خطوط بیدل کے نام جمع کیے گئے تھے جو سو، اتفاق سے ضائع ہو گئے۔

معرکہ غالب و حامیانِ قتل

ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں

علاء الدین غلجی کا زمانہ تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ منگولوں کی سفاکی و بے رحمی اور غلجیوں کی قدردانی اور علم برداری کی وجہ سے ہندوستان ظلم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور ایشیا کی منفرد بستیاں یہیں اکڑ جمع ہو گئی تھیں۔ علاء الدین نے غلجی کے دربار کے فقراء، علما، فضلا اور شعرا کی طویل فہرست دی ہے۔ غلجی نے ان میں سے صرف ۶۰ اکابر کا ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

”لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔۔۔۔ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔“

ادبیات میں ملکی اور غیر ملکی سوال کی ابتدا اور ایرانی ہندی نزاع کا آغاز بھی تقریباً اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ خسرو کی جاہلیت اور اس کی شاعری اور زبانِ انی کا اعتراف تقریباً تمام ناقدین نے کیا ہے۔ دولت شاہ عمر قندی لکھتا ہے:

”درحق او مرتبہ سخن گزاری ختم تمام است۔“

خسر کو تمام اکابر نے ”طوطی ہند“ مانا ہے :

عرفی سے یہ دوج خسرو ازیں پادسی مشکر دارم

کہ کام طوطی ہند و شاں شود مشیریں

”ماہم بعض شعراؤمی تعصب کو نہیں چھپا سکے۔ جمید جو خسرو کا معاصر ہے لکھتا ہے :

غلط افتاد خسرو راز خامی

کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

اس تعصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ امیر خسرو نے بعض محاورے ایسے باندھے

ہیں جو اہل زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ بعد میں یہ مسئلہ ”استعمال ہند“ بہت بڑا نزاعی

سوال بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کبھی بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

متاخرین میں خان آرزو نے بھی اس استعمال ہند کو جائز سمجھا۔

فیضی اور عرفی کے اختلافات اور نوک جھونک کی بھی ایک وجہ یہی ایرانی

ہندی نزاع تھی۔ خانی خان نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ فیضی کو کتوں کا بڑا شوق تھا۔

سگ بچوں کے سونے کے پتے پڑے ہوئے تھے۔ عرفی نے فیضی سے پوچھا :

”مخدوم زاد ہا بہ چه اسم موسوم اند؟“

فیضی نے کہا : ”بہ اسم عرفی“

عرفی نے برخستہ کہا : ”مبارک باشد“

ابو الفضل بھی عرفی سے جلتا تھا۔ اکبر نامے میں لکھا ہے :

”ورے از سخن سرانی برو کشودہ بوزند۔ و درخور نہ گریت و بر پاستانیان

زبان طعن کشود۔ غنیمت است واد و نطقستہ پڑمرو“

اکبر کے زمانے سے شاید ہی کوئی ایرانی شاعر ایسا ہو جس کا کلام اعتراضات کا

ملہ تذکرۃ اشعرا (لاہور) ص ۱۵۸۔

ملہ لیکن فیضی نے اپنے مکاتیب میں عرفی کی بڑی تعریف کی ہے۔

ہوت نہ بنا ہو۔ عرفی، ظہوری، قدسی، ازلالی سب ہی اس تیغ ہندی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہی حال ایرانیوں کا تھا۔ حیدری تبریزی اکبر کا معاصر ہے اور اس نے ہندوستان کی داد و پیش سے بڑا فیض اٹھایا تھا لیکن جب وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں لکھتا ہے تو اس انداز سے :

در کشور ہند شاوی و غم معلوم آں جادل شاد و جان خرم معلوم
جاسے کہ بیک روپیہ آدم نہ خزند آدم معلوم و قدر آدم معلوم
والہ ہروی لکھتا ہے :

در ہند کہ زاوگان شس تارک ادب اند

لہر بر جہالت اند و فاضل لقب اند

حز میں کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستان فضل و کمال کے لئے زمین شورہ کا حکم رکھتا ہے اُسے تمام دار الخلافہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رتبہ فضیلت لکھتا ہو۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ نزاع صرف چند الفاظ کے استعمال کی نہیں تھی بلکہ اس ضمن میں اسایب و افکار بھی معرض بحث میں آ گئے تھے۔ عبد حاضر کے ایک ایرانی محقق نے اس ہندی اسکول کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے :

» افکار و احساسات ابانی این سرزمین بہ تاثیر حوالی سیاسی و طبیعی بر سیر و عوام

توہم و تخیل و عجم انگاشتیں معانی باریک و لطیف کہ از عالم مادہ و جسم

دوری باشند متناہل است و در او اسے این تخیلات و توجہات و مسائل مزبورہ

کہ بہ منزلہ اصل و انچہ جزاوست از فروغ آسمی باشد تشبیہ مقولات است

پہمومات و بالعکس و لے رعایت تناسب تام بین مثنیہ و مشبہ بہ و بیان این

قبیل تشبیہات است بہ طریق استعارہ کہ نوع از مبالغہ و تشبیہ می باشد

نتیجہ این سبک بیان پیدایش معانی و مضامین است بسیار غریب و دور

از ذہن کسانے کہ بہ افکار ہندی آشنا نیستند و بہترین نامے کہ بہ دیں طرز بیان

می تو اس داد "خیال ہندی" است کہ منتخب و مستعمل خود ہندی ہا است۔
 نمونہ "خیال ہندی" این است کہ از منہ دل و از یک مشت سوزن بہ سازند و
 آن را در خیاط خانہ دل بہ ریزند و خیاط گریہ را بہ گویند تا از نگہ ہا و پار ہا بہ
 دل براے چشم پیراہن بہ دوزند و آن گاہ این معنی را در قالب الفخا
 فارسی بہ ریزند و پ گویند :

عرقی سے مشت سوزن بہ ولم زان مڑہ تار بخت اند
 گریہ از پارہ دل دوختہ پیراہن چشم
 و پ آں گر ہر سر مردگان بے غم خود خاک بہ ریزند و آن گاہ دست دل خود را
 بچرخند و بہ اتفاق او بہ گدائی روند تا قدرے غم بہ دست آورند و در اداسے
 اس معنی گویند :

خاک و بچہ ہر سر مردگان بے غم می کنم
 دست دل می گیرم و در یوزہ غم می کنم (انظری)

علی اکبر شہابی خراسانی نے "روابط ادبی ایرانی و ہند" میں لکھا ہے کہ اس ہندی طرز
 نے بعض ایرانیوں کو بھی متاثر کیا لیکن ایران کے بلند طبع اور صاحب ذوق لوگوں نے
 اس تقلید کو بھی پسند نہیں کیا بلکہ

شہابی نے "بک ہندی" کی خصوصیات میں :

"خیال بانی مضامین باریک، افکار پیچ و پیچ، خیالات دور از طبیعت و

استعارات و تشبیہات غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق و طبع ہندیان" اور

"مبالغہ و اغراق و بے جودہ کاری و تکلفات غیر مستحسن" پر زیادہ زور دیا ہے۔

جہاں، اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں ایرانی اثرات نمایاں ہو گئے تھے مجہ مغلوں کے

لے بہ حوالہ "روابط ادبی ایران و ہند"

سے روابط ادبی ایران و ہند (جلد ۱) ص ۹۱

۳۰ "مغلوں کے تعلقات ایران سے" از اسے ریم اسلامک کلچرل جیڈ آف دکن ۲۰۱۳ء

حزب کے ان اعتراضات کے خلاف خان آرزو نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تصنیف کیں (۱) تنبیہ الغافلین (۲) احقاق الحق۔ لیکن صہبائی کو اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

تنبیہ الغافلین میں خان آرزو نے حزب کے دیوان چہارم پر اعتراضات کیے ہیں اور اس کے تقریباً چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا ہے۔ آرزو کی چند غلطیاں مصلح السعدین میں سباز کو فی ثل دارستہ نے بھی بیان کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزب کی ایرانیست سے بہت مرعوب ہے۔

یہ سلسلہ ہمیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حزب نے تنبیہ الغافلین کا جواب لکھا اور اس کا نام ”رجم الشیاطین“ رکھا۔ (تنگستان، ص ۲۱۳) لیکن یہ کتاب ناپید ہے اور جناب منوچر سہاسی اور تو اس کے وجود ہی کے منکر ہیں۔

۱۳۶۷ھ میں مولوی امام بخش صہبائی نے قول فیصل کے نام سے بظاہر ایک غیر جانب دارانہ کتاب لکھی لیکن اس کی بھی طرز و روش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی، حزب کی طرف ذرا ہی پر تلمے ہوئے ہیں۔

صہبائی نے آرزو کے اعتراضات رد کیے ہیں اور حزب کی حمایت میں ایرانی شعرا سے استناد کیا ہے بلکہ بعض جگہ وہ بھی سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے ہیں :

”نظارہ گیان این نسخہ در یافتہ باشند کہ صہبائی بیچ دلاں کمر بہت را چست بستہ
در ہر مقام قصہ آن دارد کہ توجہ بر اس کلام شیخ بہم رساند اما چہ کند
اشال این مقامات سپہر ہی انگشتہ“

اس مباحثے میں اس زمانے کے تمام اہل علم نے حصہ لیا ہے۔ مردم دیدہ کے مؤلف نے آرزو کے بیش تر اعتراضات غلط قرار دیے ہیں۔ مرزا علی مطف نے بھی

۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں لکھی گئی۔

کے ملاحظہ ہو۔ خواص سخن۔ (صہبائی) ص ۳۱۰-۳۱۱۔

یہ قول فیصل، لکھنؤ ایڈیشن، ص ۱۳۵۔

ان کو درخرا عطا نہیں کیا۔ چنانچہ گلشن ہند میں لکھتے ہیں :

"۱۱۳۶ھ میں کہ شیخ محمد علی حزیں علی الرحمۃ ایران سے شاد جہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانہ روزگار کی ملاقات کو شاہ وگدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زاوے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے مجرب کی، آرزوہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر متقیم ٹھہرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراضات جمع کر کے ایک رسالہ رکھا ہے اور نام اس کا تنبیہ العاقلین رکھا ہے۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے۔ یہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب ہار یک مینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔"

خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک مضمون حزیں پر جولائی ۱۹۰۹ء کے مخزن میں لکھا تھا اور اس میں بھی یہ ثابت کیا تھا کہ آرزو کے بعض اعتراضات کسی طرح بھی قیہ نہیں ہو سکتے۔ خان آرزو نے بھی حد کر دی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے خاقانی کو بھی اپنے اعتراضات کی تیغ سے زخمی کیا ہے اور یہ محض اس لیے کہ حزیں نے خاقانی کو سند کے طور پر پیش کیا تھا۔

غالباً خان آرزو نے تنبیہ العاقلین کے بعد ایک اور چھوٹا سا رسالہ حزیں کی مخالفت میں احقاق الحق کے نام سے لکھا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس کا جواب اعلاء الحق کے نام سے دیا۔ لیکن تمام اعتراضات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ اعلاء الحق کا لب و لہجہ نہایت درشت اور تلخ ہے۔ خان آرزو کے متعلق لکھا ہے :

"مغر کر ساز عرصہ لاٹ، عذاب گستاخ نفس سوزی ہائے گزاف، تجبت زدہ

استیاذ باطل و حق، صاحب نسخہ احقاق الحق ہے۔

ہم نے اوپر جو مرزا علی لطیف کا بیان نقل کیا ہے اس سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ حوزے اور خان آرزو کی بخش صرف ذاتی اغراض کا نتیجہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حوزے کی کم ننگا ہی اور آرزو کی ناگواری کی سطح کے نیچے ایرانی ہندی کشمکش کا رفرما تھی۔ تذکرہ حمیت میں صاف لکھا ہے کہ خان آرزو کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ حوزے فارسی آمان ہند کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

آرزو اور حوزے کی ملاقات کا لطیف تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آرزو وہاں سے دل شکستہ لوٹے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر محمد افضل ثابت اور آرزو نے حوزے کے اس شعر پر اعتراض کیا:

ہر گنہ کہ بہ یاد و بہت غنہ نشستم

اندیشہ مرا سر بہ گو بیان عدم داد

حوزے ان "جاہلان ہند" کے اعتراض پر یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ ان کو فارسی سے کیا واسطہ۔

حوزے کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کی آزاد منش اور خود پسندی ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ

لائق مدح در زمانہ چونیست

خویشتر را ہی سپاس کنم

شاہ عالم اور شجاع الدولہ خود اس کے گھر آتے تھے اور ادب اور تعظیم بجالاتے تھے لیکن وہ ہندوستانی امیروں کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی ملازمت اختیار کرے۔

یہ یکے از عقل زندان کہ بایست گرفت دامن عاطفت شاہ خطا بخش وزیر

آن یکے می دہم چند کہ در ہند بھوئے کام بے تربیت قدر مشناسان امیر

لے اطلاع الحق، نظامی پریس، ص ۹۰۔ صاحب نسخہ احقاق الحق سے شبہ ہوتا ہے کہ صہبائی آرزو کو احقاق الحق کا مصنف نہیں سمجھتے۔

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ
 حوزیوں کو قلعہ ابنی وزارت پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔
 ایسا آدمی خان آرزو کی قابلیت کا کب معترف ہو سکتا تھا۔ آزاد نے ایک
 واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آرزو کی یہ غزل نئے نئے نغمے کے ساتھ حوزی کے سامنے پڑھی۔
 نجل آرزو سے حیا بم کہ بہ این تنگی غزلت
 انچه در کیسہ خود داشت بہ دریا بخشید
 حوزی نے نوراً اصلاح کی۔

نجل از چشم حیا بم کہ بہ یک غزل تنک
 آن چہ در کاسہ خود داشت بہ دریا بخشید
 اور کہا: "این بابا از کیسہ تا کاسہ و از تنگی و تنگی فرق نمی کند و باز خود را شاعر گوید۔"
 آزاد بھی نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو دل چسپ سے خالی نہیں۔ آرزو کے
 ایک عقیدت مند (یعنی شاہ لطف اللہ) حوزی کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرائے
 بغیر اس شعر کی درخواست کی۔

بچے دارم کہ باشد از حیا مشاطگی ننگش
 حنا گر پاسے او پسد ز شوخی می پرورنگش

حوزی نے کہا: "معلوم می شود کہ از کاسہ یسان حرام زادہ اکبر آباد است۔"
 آزاد کے اکثر بیانات غلط ہیں چنانچہ یہ روایت بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس
 لیے کہ شاہ لطف اللہ کا انتقال حوزی کے ہندوستان آنے سے قبل ہو چکا تھا
 لیکن ان قصوں سے حوزی اور آرزو کے تعلقات کی نوعیت عوام کی نظر دلوں میں
 ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔

تذکرۃ الاحوال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوزی کو اپنی قابلیت اور
 ایرانی النسل ہونے کا غیر معمولی احساس تھا اور ان کی بددماغی کبھی دوسرے کے

لے۔ بات قابل ذکر ہے کہ سیر المتاخرین کے معنی کو حوزی سے بڑا غلط تھا۔

محاسن کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے بعد ایرانی ہندی نزاع "معرکہ حامیان قتیل وغالب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مرزا غالب اپنا رشتہ ادبی دودہ جہ سے جوڑتے تھے اور اس پر انھیں غیر معمولی فخر و ناز تھا۔ اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔

غالب بہ گہر ز دودہ زاد ششم

زبان رو بصفائے دم تیغ ست دم

گہر از دایت شاہان عجم پر چسبند بوعوض خامہ گنجینہ فشاخ دم داوند

افسردہ تارک ترکان پیشنگی بردند بہ سخن ناصیہ منہ کیا تم داوند

ساقی چمن پیشنگی و افراسیاب ہم دانی کہ اصل گوہر از دودہ جہم است

میراث جہم کہ سے بود اکنوں بہن بپاد زبان پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

مرزا غالب، سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں :

"ترک ز آدم و لب من بہ افراسیاب و پیشنگی می پیوند دہ

جو شخص دودہ جہ سے تعلق رکھتا ہو، وہ فارسی نویسان ہند کو کب خاطر میں

لا سکتا تھا۔

غالب نے قاطع برہان میں اپنے آپ کو اہل زبان میں شامل نہیں کیا :

"حاشاکہ خور از اہل زبان گیرم" لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی کی سلاقی اور

راستی پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ صرف اہل زبان ہی کو سراوا دہ ہو سکتا ہے یا اس شخص

کو جس کے بھڑ میں ہزار غرور پوشیدہ ہوں۔

غالب کا دعویٰ یہ ہے کہ زبان فارسی سے ان کو "بیوند ازلی" ہے اور ایک

"جاما سہ عہد" اور "بزرگچہر عصر" کے سامنے انھوں نے زانوئے ادب بھی تکیا تھا۔

ملے نیرط حنفیہ پند فیصد حسن عسکری، چند کا مقام "شیخ علی حزیں پر کچھ نئی روشنی" جو انھوں نے

۱۹۳۳ء میں انڈین ہسٹری کا مجلہ میں چھپا تھا اور جناب سید فراز خاں صاحب کا مقالہ

شیخ محمد علی حزیں پر۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

” ملا عبد الصمد (ہرمزد) استاد غالب (غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا۔

بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا دخل ہوگا.... عبد الصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز کھل چکا تھا۔ دونوں زبانوں کے مراعات کی صحیح شائیس اسے معلوم تھیں۔

سرولیم جرنس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں انھیں سے کام لیا گیا ہے۔“

ملا عبد الصمد کا وجود تھا یا نہیں۔ یہ سلسلہ بڑا مباحثہ انگیز رہے لیکن خود غالب کا بیان یہ ہے کہ اس کی مدد سے فارسی زبان کی حقیقت ”دل نشین“ اور ”خاطر نشان“ ہو گئی۔

لیکن اس معاملے میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ اپنے آپ کو فارسی کا تنہا وارث سمجھتے تھے اور ابتدا ہی سے ہندوستان کے متقدمین و متاخرین فارسی دانوں میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کے غور کی شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔

ہر چند زمانہ جمیع جہاں است دژ جہل نہ حال ثنائی یک موال است

کو دن ہمہ یک از یکے دگرے فرق خریصی و خرد جہاں است

معمر کا حامیان قلیل و غالب اسی ایرانی بندی نزاع کی ایک کڑی ہے۔ غالب کی قلیل دشمنی کو اگر اس پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو ان کے انگار و امیال اور موافقت و مخالفت کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔

اس ادبی جنگاے کے برپا ہونے کا فوری سبب یہ ہوا کہ مرزا غالب اپنی پنشن کے سلسلے میں ۱۲۳۷ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں ایک مشاعرے میں غالب نے ”گماں بر خیزد“ ”میاں بر خیزد“ غزل پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے :

۱۔ غالب۔ از غلام رسول ہرم : ۲۷۔

۲۔ دیکھیے ”غالب کا ایک فرضی استاد“ علی گڑھ میگزین ”غالب نمبر“ : ۶۵۔

۳۔ ملاحظہ ہو : غالب نامہ : ص ۳۲۔

جزو از عالم و از ہمسہ عالم ہمیشہ

ہم جو ہوئے کہ بتاں را زمیناں بر خیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمہ کے ساتھ اس کا ربط بہ اجتہاد و قلیل درست نہیں ہے۔ کفایت خاں نہیں ہر اس بھی شاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے "ہمہ عالم" کی سند سعدی و حافظ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔
دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ "زمیناں بر خیزد" صحیح نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض "کدہ" کے استعمال پر تھا بلکہ

غالب نے ان اعتراضات پر چل کر کہا کہ "میں فریاد آباد کے کھتری بچے کا قول نہیں نشاۃ کلکتہ میں غالب کے معترضین کی تعداد کافی تھی اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبد الغفور نساخ نے یہ لکھی ہے کہ کلکتہ کے قیام میں غالب کا بلنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا۔ ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی۔ بلکہ کفایت خاں نے کلکتہ کے شاعروں کو چھوڑ کر صرف غالب ہی کی قدر افزائی کی۔ حاجی علی محمد کرم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کو چک نام مقیم تھے۔ انھوں نے مجلس عام میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا: اس وجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔ یہ باتیں مخالفین پر داشت نہیں کر سکتے تھے۔

غالب نے اس واقعہ کی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو اس طرح اطلاع

دی ہے :

"از نوادر حالات این کہ سخن و زبان و نکتہ رسان این بقصد پس از ورود
خاکسار بزم سخن آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شخصی انگریزی روز یک مشغہ
غضبتین سخن گویاں در مدرسہ سرکار گپنی فراہم شدندے، و غزلہا سے
ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مدرسہ کے از ہرات بر سفارت

ملہ ملاحظہ ہو، غالب نامہ، ص ۳۲

ملہ غالب از ہر اشاعت سوم، ۱۳۳۰ ہ روایت مولانا ابوالکلام آزاد۔

رسیدہ است در آں انجمن می رسد اشعار مرثیہ بہ بانگ بلند نامی ستاؤ
و بر کلام نادرہ گویان این قلم رو بہ مستم ہائے زیر لبی می فریاد چوں طباطبائی
بالذات مفتون خود نمائی است ہم گناں حمدی بر بند و کلانان انجمن و
فرز انجمن فن برد و بیت من اعتراض نادرست بر آوردہ آں را شہرت
می دہند

مرزا غالب نے اعتراض سے تنگ آکر ایک مثنوی "باو مخاطبت" لکھی جس میں
معنی بردوانی فلسفے سے معذرت کی لیکن اس مصاحبت میں بھی کئی بڑا شعر چھپے ہوئے تھے،
نکلتے ہیں: "نہ بس نے قلیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا" نہ اس کی شہرت پر رشک ہے
نہ اسے بُرا کہتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ:

طالب و عرفی و نظیری را	دامن از کف کنم چسبگونہ رہا
آن ظہوری جہان معنی را	خاصہ روح روانی معنی را
چہ شناسد قلیل و واقف را	آں کہ طے کردہ ایں موافق را
می سرانم نواس مدح قلیل	می شوم خویش را بصلح و صل
رسد از پیروان دے صلہ	تا نہ ماند زمن و مگر گلہ
سعدی شامیش نہ خواہم گفت	گرچہ ایرائیش نہ خواہم گفت
از من و ہم چرم ہزار بہ است	یک از من ہزار بار بہ است
خاک را کہ رسد بہ چرخ بلند	من کہ خاک را دوسپہر بلند

لے کلیات شرف غالب: ۱۷ (فول کلڈ ۱۲۸۷)۔ خطوط بنام عبدالغفور سرور اور عبدالرزاق شاہ کرہی
دیکھے جائیں، احمد ہندی صفحات: ۱۷، ۱۸ (طبع علی گڑھ ۱۹۲۷)۔

۱۷ نیز ملاحظہ ہو "باو مخاطبت کی اولین روایت" از قاضی عبدالودود۔ بڑے تماشے کی بات یہ ہے کہ
غالب، قلیل کی بڑی تعریف کرتے ہیں، جو طبع ہی یہی، مگر اس کی سند اس بنا پر کہ وہ ہندی ہے قبول
نہیں کرتے۔ مگر بتدل کی سند خود پیش کرتے ہیں۔ "شعر یہ لہجہ تہذیب نیست" اولین روایت
میں نہیں، بعد کو چلے آیا ہے۔

دست او صد چو منے نہ بود
بہر درخورد روز نے نہ بود
مرحبا ساز خوش بیاہئے او
جہذا شور نکستہ واسیئے او
نقش آب حیات راماند
در روانی فراست راماند
نثر و نقش بال طاوس است
در انتخاب صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلم رد حرف
کردہ ایجاد نکستہ ہاے شگرف
خام بند وے پارسی دانش
ہندیاں سر بہ خط فرمانش
این رقم ہا کہ رست کاک خیال
بود سطرے زنامہ اعمال
از من تار سائے بیج مد اں
معذرت نامہ ایست لے یاراں
بو کہ آید ز معذر خواہی ما
رحم بر ما و بے گناہی ما
آشتی نامہ و داد و پیام
ختم شد و اسلام والا کرام

غالب کی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمے کو بڑا دخل حاصل ہے جس میں وہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۴ء تک اُلجھے رہے اور روپیہ ملنے کی امید میں قرض لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ "غلم رسوائی" جاوید یعنی قید فرنگ میں مبتلا ہو گئے۔ غرض خد کے زمانے تک ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ بمبویاں قنیل کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھا سکیں۔

خدا کے زمانے میں مرزا غالب نے ایک روز ناچھ "دستجو" کے نام سے لکھا اس میں انھوں نے خالص فارسی میں "جہاں داران داد آسوز" دانش اندوز، نکو خو، نکو نام" (انگریزوں) کی تباہی اور بربادی کا بھی ذکر کیا ہے اور یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات جمع کیے ہیں۔ خدا کی خانہ نشینی ہی کے زمانے میں انھوں نے 'برہان قاطع' دیکھنا شروع کی اور اس کے اغلاط نوٹ کرتے رہے۔ غالب نے ان کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا اور ۱۸۶۲ء میں چھپوایا۔

سے 'قاطع برہان' کا دوسرا ایڈیشن 'دانش کاویانی' کے نام سے نئے اضافہ مطالب و نوادہ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

‘قاطع برہان’ کی اشاعت نے ۱۸۲۹ء کے کالمٹہ والے ہنگامے کو پختہ ازہ کر دیا۔ بقول غالب
 ”باسی کوڑھی میں اُبال آگیا۔ اور ان کو آخر وقت تک اس مخالفت سے نجات نہیں ملی۔“
 ‘قاطع برہان’ ایسی ہنگامہ خیز کتاب تھی کہ کچھ عرصے کے لیے ساری نفسِ مکتدہ
 ہو گئی اور مخالفانہ لٹریچر کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تفصیل جیل ہے:

(۱) ‘محرّق قاطع’ (مولوی سادات علی خاں)

(۲) ‘ساطع برہان’ (مرزا رحیم بیگ میرٹھی)

(۳) ‘قاطع القاطع’ (امین الدین پٹیاوی)

(۴) ‘مؤید برہان’ (آغا احمد علی)

(۵) ‘تبیخ تیز تر’

(۶) ‘شمشیر تیز تر’ (آغا احمد علی)

اس مخالفانہ لٹریچر کا جواب غالب کے دوستوں اور مؤیدوں کی طرف سے
 ان کتابوں کے ذریعے دیا گیا۔

(۱) ‘دافع ہدیان’ (مولوی نجف علی)

(۲) ‘لطائف نصیبی’ (سیف الحق تیاچ) تمہ کا قیاس ہے کہ یہ کتاب غالب کی
 نکلی ہوئی ہے۔

(۳) ‘سوالات عبد الکرم’۔

(۴) ‘نامہ غالب’ از مرزا غالب

(۵) ‘تبیخ تیز’ مولفہ غالب

(۶) ‘ہنگامہ دل آشوب’ وغیرہ۔

اس سلسلہ میں تلخی کا پیدائہ ہونا حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ موافق و مخالفت
 دونوں جماعتیں ناملائم الفاظ پر اُتر آئیں اور طنز اور دشنام کے ترکش کا کوئی تیسرہ

نہ ‘غالب’، ۳۳۱ اشاعت سوم، نیز ملاحظہ ہو، علی گڑھ میگزین، غالب لبر

لطائف نصیبی اور غالب از عبد الحمید سالک، ۱۳۲

ایسا نہیں تھا جو انہوں نے صرف نہ کیا ہو۔

اس تمام مزید کو اس نظر سے جانچنا اور پرکھنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے، تحقیق کا ایک دلچسپ موضوع ہے اور اس کے لیے ایک علاحدہ فرصت درکار ہے۔ یہیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ایرانی ہندی نزاع کے سلسلے میں اس کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

اگر جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غالب نے قاطع برہان لکھ کر علمی خدمت انجام دی اور اس ایرانی ہندی نزاع کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک تشنہ بحث تھے۔

رضا علی خاں ہدایت صاحب مجمع الفصحا نے فرہنگ انجمن آراء ناصر میں غالب کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے۔ لیکن اس بحثا بحثی میں ذاتیات پر حملے ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس مباحثے کی علمی اور تحقیقی حیثیت ختم ہو گئی۔

مرزا غالب شروع ہی سے قلیل و واقف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے آپ کو عرفی و ظہوری کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔ گلہ کے مشاعرے اور برہان قاطع کے ہنگامے نے غالب کے جذبہ مخالفت میں شدت اور عصبیت پیدا کر دی۔ ان کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جس سے بھی قلیل کا تعلق ملتا تھا اسے اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے قلیل کی چار شریعتیں لکھی ہیں۔ غالب اسس تعلق کو کب برواست کر سکتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"غیاث الدین رام پوری ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقل و ناقل۔ جس کا مانعہ

سے قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جو غالب اور حامیان برہان قاطع میں باب النزاع ہیں، بات نے جو کچھ لکھا ہے (فرہنگ نگار کی حیثیت سے) نزاع کی صورت اخذ کر کے بغیر اور اس سے کسی قسم کی واقفیت کا اظہار کیے بغیر وہ اسی فی صدد وہی ہے جو برہان میں ہے۔

اور مستند علیہ قاتل کا کلام ہوگا۔ اس کا قرین ثبوت یہ کیا فرجام ہوگا۔
مولوی غلام امام شہید چونکہ قاتل کے شاگرد تھے اس لیے ان کے متعلق
ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں :

”مقتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قاتل وہاں کوں انا ولا غیر
بجھا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔
غالب ہر جگہ قاتل کو ہندی فارسی دانوں کا نمائندہ اور اپنے آپ کو فارسی دایان
ایرانی تہذیب کا علم بردار لکھتے ہیں :
”یہ فارسی لڑ قاتل کی ہے۔“ ایک گاؤں پتھر بہ روز سحر کچھ باتیں کرنے لگا۔
جنی اسرائیل اسے خدا لکھے۔“

”قاتل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً نا آشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی
کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں
مالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیش تر
سادہ کشمیری یا کاٹلی یا قندھاری و مگوانی۔ احمیاتا عامہ اہل ایران میں سے
بھی کوئی ہو، مانا غلط ہے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر
اور ہے۔ اگر تقریر بہ عینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ و عطا و شرف الدین
علی بدوی اور مائے حیین و اعظما کا خلق اور طاہر و حمید یہ سب نثر میں کیوں
خون جگر کھاتے۔ وہ سب اسی طرح کی نثر میں جلال دیوانی سسٹلہ قاتل
مستوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہے، رقم نہ فرماتے بلکہ
صاحب عالم کو لکھتے ہیں :

”اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قاتل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سب اہلیات الدین۔“

لے شعراء غالب، ص ۱۱۷۔

لے آردو سے منقول : ۳۷۸ (لاہور، ۱۹۳۰ء)۔

لے شعراء غالب : (پشاور، مئی ۱۹۶۱ء)۔

لے عم، جلد ۱، ص ۱۵۱ (طبع علی گڑھ) : عہدہ شعراء سہد کے نام۔

داسپوری نے مکھ دیا۔ طور کر رکھ وہ خزان نامشخص کیا کہتے ہیں، اور میں سخت و
درد مند کیا بکتا ہوں۔ دانشمند قیقل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین
فارسی جانتا ہے۔۔۔ ان غولوں پر منت کر دے۔

قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

”مگر پیر پری قیقل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے :
تفتہ کو لکھتے ہیں :

”لفظ ”بے پیر“ تورانی پنجہ پاس ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے مرزا جمال امیر
علیہ الرحمہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے
باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر نژاد
ایران ایسا لفظ لکھے :“

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان دانی، فارسی میری ازلی دست گاہ ہے اور یہ عطیہ
خاص منجانب اللہ ہے اس لیے اگر کوئی غلطی ان کی دانست میں ایرانیوں سے بھی ہوئی
ہے تو اس پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور موقع پر تفتہ کو لکھتے ہیں :

”فارسی میں مہدائیاں سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط

سے عود ہندی : ۲۲

سے اردو سے معلیٰ : ۳۰۳

سے خطوط غالب : ۱۹ حالانکہ بے پیر بہت قدیم ترکیب ہے۔ غافانی، طالب آملی، صاحب اور
اشرف کے یہاں موجود ہے (”غالب“، حیثیت محقق، علی گڑھ سٹوڈنٹس، غالب لبریری، ۱۹۰۶)۔

سے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اردو تعلیم کے قائل نہیں تھے۔ حویس کے ایک مصلح کا انکار کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے
ہیں، ”حویس کے اس مصلح میں واقعی ایک ہنوز زاید اور بے ہودہ ہے۔ مصلح کے واسطے شد نہیں ہو سکتا۔ یہ
غلط محض ہے، یہ قسم ہے، یہ عجب ہے، اس کی پیری کون کرے گا۔ حویس تو آدمی تھا، یہ مصلح اگر چہ ریل کا
ہوتا تو اس کو سند نہ ہوتا۔“ (خطوط غالب، ص ۲۳)۔ وہ مصلح یہ ہے کہ

زنگ تازی آں ناز نہیں سوار ہنوز زسبہ می دور انگشت در منبہار ہنوز

اسی خط میں لکھتے ہیں : ”نظر غفلت۔ اور زنگ غفلت۔ ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی جبر گیل تفتہ اور قاضی الدین
ظہیری نے لکھا ہو“ (خطوط غالب، ص ۲۲)

میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جو ہر شے۔

”سنو میاں، میرے ہم وطن جو داری فارسی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو نقل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گھسا گھس اتو عبدالواسع حفظہ ناماؤ کو غلط کہتا ہے اور یہ اتو کا پنٹھا قتیل ”صفوت کدہ“.... اور ”ہمد عالم“ کو غلط کہتا ہے، کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو ”یک زبان“ کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میسزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے، فخر الحمد و ثناء لشکر علیہ۔“

یہی وجہ ہے کہ غالب ہندوستان کے سخن دروں میں سوائے خسرو کے اور کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے تھے۔ سرور کو لکھتے ہیں:

”میں اہل زبان کا پیر و اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدا یا متاخرین میں مثل صاحب و کلیم و امیر و حواریں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

”کلام سعدی و حمزہ کے امثال و نظائر کا مستند علیہ ہے۔ مذکورہ اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔“

غالب کی دلی

غالب کی دلی عالم میں انتخاب تھی۔ مرسولی اس کے الفاظ میں چنین سے ساحل سے لے کر قسطنطنیہ تک کوئی شہر دید و دانش میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف شہر نہیں ایک بڑی تہذیب کا مرکز اور علم و فن کا گہوارہ تھا۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب نے یہیں بدور کش پائی تھی۔ معمولی بولیوں کو ادب کی کرسی نشینی کا شرف یہیں حاصل ہوا تھا۔ گیسوئے اردو یہیں سنوارے گئے تھے۔ حاتم سے لے کر حالی تک تمام اسالیب یہیں وجود میں آئے تھے یہیں تصوف نے انسانیت اور ورد و مندی کا ایک وسیع تر تصور پیش کیا تھا۔ علم حدیث نے یہیں ترقی کی علامتیں ملنے کی تھیں۔ علم طب نے یہیں میمانی کی تھی یہیں علم و ادب کی شخص کو اس شان سے فروزاں کیا گیا تھا۔ کہ دور دور تک تاریکیاں بھٹ گئیں۔ یہیں علم دین و شعر و سحر، طب اور تاریخ و نجوم میں وہ میمار قائم کیے گئے کہ غرناطہ و بغداد کی یاد تازہ ہو گئی۔

سلطنت مغلیہ کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہادر شاہ اول کے زمانے سے لے کر

نادر شاہ کے محل تک اس کے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تو رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ مٹلوں کی بربادی دراصل ۱۷۲۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ نادر شاہ کے محلے نے ان کی کمر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ لازم سلطنت بجز نامے باقی نہ اند۔ نادر شاہ نے ہندوستان کا وہ سترہواں کیا کہ مٹروں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بستیاں ویران اور بے چراغ ہو گئیں۔ ایک وقت تو ایسا آگیا تھا کہ مسلمانوں نے جوہر کی رسم ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مال غنیمت بھی جو ہاتھ لگا اس کی مایت اکٹھا کر وڑے کم نہ تھی۔ یہ دولت ایک دن کی نہیں، آٹھ بیڑیوں کی جمع کی ہوئی تھی۔ آئندہ رام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔ جان کا نقصان اس سے زیادہ تھا۔ لڑائی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس ہنگامہ و آشوب میں تیس ہزار سے کم آدمی تہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے۔

نادر شاہ کی غارت گری کے بعد لوٹ کھسوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جاٹ مرچے۔ روہیلے اور فرنگی سب ہی ظلم و ستم پر آمادہ تھے۔

ہرچرن داس معصفت گلزار شجاعتی نے جاٹ گردی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی غارت گری سے ڈر کر دہلی کے باشندے اس طرح مارے مارے پھرتے تھے جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے پھیرے کھا رہا ہو۔ مرہٹوں کے متعلق گنگا رام نے لکھا ہے کہ وہ دیہاتوں کو لوٹتے۔ لوگوں کے ہاتھ ناک، کان کاٹ لیتے اور خوب صورت عورتوں کو رسیوں میں باندھ کر لے جاتے۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک نو مرتبہ ہندوستان کو زبردستی بر کیا اور کوئی چیز خوردنی اور پوشیدنی نہیں چھوڑی چھین کر ادیں۔ کسی کے گھر میں بدوشش ستر اور قوت یک روزہ بھی باقی نہیں رہی۔

ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست و پا تھے ہرزہ دست کے گھوڑے ان کے کھیتوں کو پا مال اور ہر جاہر امیر کے سپاہی

ان کے گھروں کو سب پر آخ کر سکتے تھے۔ روزی کا بکھٹک نہیں تھا۔
 بچ کو بی تو شام کی خبر نہیں۔ دست کار، صنایع، کسان، مزدور، وسیع د
 شریف سب ہی پریشان اور مضطرب تھے۔ کی زمین کے کم ہو جانے سے
 خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے خاتمے گزرتے تھے اور ”سلاطین“ کی
 حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم بڑھتا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی۔
 مرزا رفیع سودا نے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ اب تو کروی نہیں ملتی۔ انگریز
 گھوڑا جو کوئل اور مزہرا ہے لے کر گئے بھی اور تو کروی مل بھی گئی تو تنخواہ نہیں
 ملتی۔ افلاس کا یہ عالم ہے کہ علف و دانہ کی خاطر
 شمشیر جو گھر میں تو سپر بیٹے کے پاں ہے
 سودا کا شعر ہے۔

روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
 کہ اس زمانے میں پھٹلے ہے وہ یا گول

سال سال بھری ملازمت کے بعد بھی ایک جہ تنخواہ کا وصول نہیں ہوتا۔
 سپاہیوں پر ہی موقوف نہیں ہر پیشے شاعری و ملائی، خطاطی و صنایع سب
 کا یہی حال تھا۔ جاگیر داری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان
 ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بد حالی کے اس اندھیرے میں
 انگریز جن کے پیچھے صنعتی انقلاب تھا اور تاریخ کی برصغریٰ ہوتی تو تیں تھیں۔
 اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ بجا رہے تھے۔ ہندوستان کی کوٹھی سے ان
 کے مشین انقلاب میں جان پڑی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے۔
 ہندوستان کی دولت و شہرت جو کچھ کہ تھی

کافر فرنگیوں نے تہہ بھر کینچ لی

انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بنگال پر اور ۱۸۵۷ء میں میسور پر قبضہ کر کے
 ہماری اقتصادی شہرگ کو کاٹ دیا تھا۔ اور وہ روز بروز اس مامن و ف

یعنی دہلی کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بقول مصحفی

نہد بس قلعہ کے نیچے ہی تک ایک امن و امان ہے

چنانچہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ ٹیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر اور نابینا شاہ عالم کو جس کی حکومت بلا ہمالہ دہلی سے ہالم تک باقی رہ گئی تھی مرہٹوں سے لے کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سری اور جن گانو کے صلح نامے کی رو سے سندھیانے دواب کا سارا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شانِ علم اور شوکتِ دم خیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہو گئی اور اکبر شاہ ثانی کے متعلق یہ جملہ ضرب المثل بن گیا تھا۔

اکبر شاہ ثانی۔ چولھے آگ نہ گھرے پانی : دورانِ تیموریہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مغلوں کی حکومت لفظاً اور معنیاً سمٹ کر قلعہ کی چہار دیواری تک رہ گئی تھی۔

لیکن دلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب و جگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ ہر طرف اسی کی تہذیب کا سک رواں تھا اور حضرت دہلی کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۱۳ء بلکہ اس کے بعد بھی ہندوستان کے فرماں روا اور راجے ہمارا جے اپنی تخت نشینی کو اُس وقت تک قلعہ نہیں بگھتے تھے جب تک دہلی کے مجبور اور بے دست و پا بادشاہ کی مہر و توثیق ثبت نہ ہو جائے بلکہ

ان انتشاری درجانات سے یہ سمجھنا کہ اس زمانے کی تاریخ محض شورش پسندی یا عیش کوشی کی داستان ہے یا اس زمانہ کا ادب، رات اور زلف کی کہانی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے

متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا وقت کی ان عام مایوسیوں میں خیرت اور شجاعت۔ ایثار و کرم۔ علم و فن۔ قیمت اور رواداری کی حیرت انگیز مثال مل جاتی ہیں۔ غالب کی زندگی اور شاعری کو اسی سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس بڑے نقش میں بادشاہوں اور امیروں کی غلط محشی یا رنگین مزاجی اتنی اہم نہیں جتنی غالب کی حکیمانہ ذہانت اور شگفتہ متانت۔ تاریخ میں ایک محمد شاہ، ایک ابوالسحاق، ایک لونی شانزدہم ہمیشہ ہوا ہے۔ اس کی پرچھائیں اور اس کا نعرہ دہاتے ہو فردا در میں خفا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ لیکن جس چیز کو زوال نہیں وہ اس زوال پذیر معاشرہ میں غالب کا ثبات قدم، بچنے کا سلیقہ اور اقتدار عالیہ پر ایمان ٹک رہا ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ”مخلوں کے جاہ و جلال کا اصل گہوارہ شاہ جہاں آباد تھا لیکن غیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان فن تعمیر کا شاہکار اکبر آباد میں ہے بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلند حسن و شعر ہے۔“

مرزا اسد اللہ خاں غالب شب، ششم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء کو اگرہ میں پیدا ہوئے اور ۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں بیہودہ زمین ہوئے ان تہتر برس اور چار مہینے کی داستان ہمارے خطبات کا اصل موضوع ہے جس کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) غالب کی ولادت سے ۱۸۵۶ء کے انقلاب تک اور

(۲) ۱۸۵۶ء سے غالب کی وفات تک

غالب ارض تاج میں پیدا ہوئے جہاں قیمت کی سب سے بڑی یادگار ایک

غالب مرہی کی شکل میں موجود ہے۔ یہیں غالب کی حسین اور ذہین شاعری کی ابتدا ہوئی جس کا ہر نقش فریاد ہی ہے اور ہر شعر ہلکوں سے ڈھلکتا ہوا آنسو

گد جوں اشک از سر رخاں چکیدہ نم بستگر

آگرہ، راجستھانی اور برج بھاشا کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں کی زبان نے اردو کی تشکیل میں جو کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل ہے نمایاں حصہ لیا ہے۔ مرزا غالب کی والدہ اسی شہر آگرہ کے ایک معزز گھرانے کی تھیں۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ریاست اللہ میں مارے گئے۔ یتیم ہونے کے بعد ان کی نگرانی ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو اس وقت مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے گورنر یا صوبے دار تھے۔ جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر آگرہ پر قبضہ کر لیا تو یہ بے روزگار ہو گئے اور ان کی جگہ ایک انگریز کزن مقرر ہو گیا لیکن نواب احمد بخش خاں نے جن کی بہن مرزا نصر اللہ بیگ سے منسوب تھیں اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے ان کو کہہ سن کر انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسالہ دار مقرر کر دیا اور دو پر گئے بھی ذات اور سوار کے خرچ کے لیے عنایت ہوئے لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ نصر اللہ بیگ خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب نے یہ ابتدائی زمانہ اپنے چچا کے یہاں نہیں بلکہ نانا کے یہاں گزارا۔ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں ”مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خزانہ داماد کے اپنی تمام عرس سرائی میں بسری اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی تھی“

افسوس ہے کہ ہمیں غالب کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کی خنیاں بہت آسودہ حال تھیں اور آگرہ میں انہیں ہر قسم کی آزادی اور آسائش میسر تھی۔ منشی شیونرائن کے خط میں انہوں نے اپنے شہر نج کھیلنے اور بلوان سنگھ (مشہور و معروف راجہ جیت سنگھ کے بیٹے)

کے ساتھ پتنگ لڑانے کا ذکر کیا ہے۔ اور مہر نیم روز میں اپنی اس بے ہودہ کوشش اور اوپاشی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ آہ ز عمر کے گزشت ایس جنیں۔ تذکرہ سرور میں جو غالب کے قیام آگرہ کے بہت اہم ماخذ میں سے ہے لکھا ہے۔ اسد اللہ خاں اسد عرف مرزا نوشہ، مولد کش اکبر آباد، جو اس قابل، یار، باش در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز، تربیت یافتہ غم کدہ نیاز، آگرہ میں غالب کا ماحول شاہد و شعر و شراب کا تھا لیکن اس بہو و لعب کے باوجود انہوں نے مرد بہ تعلیم بھی حاصل کی اور منطق و فلسفہ ہئیت اور طب میں اچھی خاصی دسترس بہم پہنچالی تھی۔ فارسی سے انہیں مناسبت اصلی تھی۔ تذکرہ گلشن بے خزاں میں لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ معظّم اور نظیر اکبر آبادی سے بھی درس لیا تھا۔ مرزا غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے فارسی کے غوامض ملا عبد الصمد ہر مزے جو جانا سب عہد اور بزرگ عمر صرتھا، دو برس تک سیکھے لیکن مولانا حالی کے برخلاف قاضی عبد الودود کا خیال ہے کہ ملا عبد الصمد فرضی نام ہے اور اس کا کوئی وجود خارجی نہیں تھا۔

مرزا غالب کی نہیں کتنی ہی آسودہ ہو اور ان کے ساتھ کتنا ہی اچھا سلوک کیوں نہ ہوا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے والد کی حیثیت خانہ و اسناد کی تھی اور اس کی وجہ سے گرد و پیش کی جاہ و ثروت کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک خاص باطنی خلش ضرور پیدا ہوتی ہوگی۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا غالب کی شادی ذوق کشتاگر دادر نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہو گئی اور اس طرح ان کا تعلق دہلی کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے قائم ہو گیا جو نہ صرف دولت مند تھا بلکہ شعر و ادب میں بھی ذمی حیثیت تھا۔

غالب پانچ پچھ سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے تھے لیکن پندرہ سولہ برس کی عمر میں مستقلاً دہلی میں اقامت گزیریں ہو گئے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ آنے جانے کا سلسلہ رہا۔ انھوں نے منشی شیونرائن کو جو خط اپنی پتنگ بازی کے ذکر میں لکھا ہے وہ انٹھارہ انیس برس کی عمر کا واقعہ ہے۔ غالب کے چچا نصیر اللہ خان کے انتقال کے بعد ان کی پیشین گوئی احمد بخش خاں کی جاگیر میں مشاغل ہو گئی تھی اور وہی ان کے ورثہ کے کفیل بھی تھے۔ دوسرے ان کی بھینسی سے غالب کی شادی ہو گئی تھی اس لیے وہ اگرہ چھوڑ کر دلی میں رہنے لگے تھے۔

غالب اس زمانے میں دلی آئے جب دہلی میں نسبتاً امن چہن تھا۔ بقول مولانا حالی ”حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلائی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:

ہند را خوشش نفا تہد سخنور کہ بود

بادور خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انکاء

حسرتی اشرف و آزدہ بود اعظم شاں

غالب سوختہ جاں گر چہ نیرزد بشار

ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدہم شاں

مولانا حالی نے اس کے بعد لکھا ہے:

”اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس بار

میں پت جملہ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے

اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے

دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے

بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اشتیاق نظر نہیں آتا۔ یہ
سر سید نے تذکرہ اہل دہلی میں لکھا ہے:

”ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہندوؤں کا گلدستہ
ہے۔“

مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندی علماء علم حدیث
کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو علم ختم ہو چکا ہوتا۔ ان محدثین میں حضرت شاہ عبدالعزیز
کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے۔ ان کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ
انہوں نے انگریزی علوم سیکھنے کی ترغیب دی لیکن اسی کے ساتھ انگریزی تسلط
کی مخالفت بھی کی اور اس پورے علاقے کو جو لارڈ لیک کی فتح یا بی کے بعد
انگریزوں کے زیر نگیں آگیا تھا دارالحرب قرار دیا۔ انہوں نے قومیت کا
وسیع تر تصور پیش کیا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ ان
کا خیال تھا کہ کرشن جی عارف باللہ ہیں اور خدا کو پرمیشور کے نام سے بھی یاد
کیا جاسکتا ہے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اپنے قدم دہلی میں جمائے تھے۔ اس دہلی میں
جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ دوسرے شہر اور بلاد کینہیں اور
لوڈیاں ہیں اور دہلی مالک اور رانی۔ یہ موتی اور باقی سب کے سب سیپیاں۔“
دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا دل تھی اور اس کے علاوہ راست روی اور
غیرت قومی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو۔ ان کا
فتویٰ جہاد نہ سرہٹوں کے خلاف تھا نہ سکھوں کے۔ حالانکہ ان دونوں طاقتوں
کا اثر بہت دور تک پھیل گیا تھا ۱۸۵۷ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد

انگریزوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جہادی تحریک کا رخ کلیتاً انگریزوں کے خلاف ہو گیا اور ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک انگریزوں نے بیس دفعہ ۶ ہزار لشکر کی مدد سے جہاد یوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ تحریک کبھی نہیں جاسکی۔

دہلی علما کی تمام تر سعی یہ رہی کہ اسلام کو خارجی عناصر سے پاک کیا جائے لیکن وہ ہندوؤں سے اتحاد کرنے اور ان سے مدد لینے کے دل سے حامی تھے۔ ان کی رواداری اور اتحاد پسندی کا یہ اثر تھا کہ ہندو مہاجن ، ہندو راجہ ، ہندو تحصیل دار ، ہندو سامعین اور ہندو ترجمین سب ان کی خاموش تائید کرنے والوں میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کو ہندوؤں کا تباہ و برباد نہ ہوتا تو ان کی جہادی تحریک ہنگامی سے ساورتیک اور سرحد سے کمزور ہو جاسکتی۔ اس لیے کہ مجاہدین کی تمام تر مدد ان ہی علاقوں سے گزر کر جاسکتی تھی۔

مرزا غالب کو نہ دہلیوں سے خصومت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ ان کے دوستوں میں ختم العلماء مولانا فضل حق خیر آبادی بھی تھے جنہوں نے غالب کو طرزِ بیدل کی پیروی سے نجات دلائی۔ رام پور سے ان کا تعلق استوار کر دیا اور جو دہلی تحریک کی مخالفت کے ساتھ انگریزی حکومت کے بھی سخت مخالف تھے ، انہوں نے بہادر شاہ کے لیے دستور العمل سلطنت مرتب کیا تھا جس میں گاوڑ کشی کی ممانعت تھی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور تھا۔ ان کو حکم دوام جس ہو اور ۱۸۶۱ء میں رنگون میں انتقال فرمایا۔

دہلی تحریک مذہبی بھی تھی ، سیاسی بھی ، ادبی بھی — اس تحریک

نے وہ آزادی جرات اور بے باکی پیدا کی جو اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتی۔ دہلوی علما اور مرزا غالب کے راستے الگ تھے لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علما نے مذہب و رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنام تجالی کو توڑا اسی آزادی سے مرزا غالب نے فن لغت اور فن شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر پڑائی لکیر صراطِ مستقیم ہے۔

مولانا حالی اس بات پر متفق ہیں کہ سرسید میں بھی جو آزادی خیال اور جراتِ گفتار ہے اس کا سرچشمہ بھی دہلوی علما کی تحریروں اور تقریریں ہیں۔

غالب کے معاصر اور حضرت شاہ عبد العزیز کی مجالس و عظ کے حاشیہ نشین مومن کو چہ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے تیار ہیں اور شب و صبح غیر کاٹنے کے لیے آمادہ لیکن جب وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اتنے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس ماہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ مرزا غالب کو بھی حسرت رہی کہ وہ جہادی قافلوں میں شریک ہو سکتے اور ان کے دوش بدوش لڑ سکتے لیکن جس طرح ان کی مثنوی امتناعِ نظیر خاتم النبیین محض ایک ادبی لطیفہ ہے اسی طرح ممکن ہے کہ یہ آرزو بھی مشاعرہ اسلوب سے زیادہ نہ ہو لیکن اس وقت بلاشبہ پوری دلی اس تحریک سے مسرور تھی اور ان دہلوی مقررین اور مصنفین کی خوش گفتاریوں کے آگے بہت سے چراغِ مدھم ٹٹ گئے تھے۔

شاہ عبد العزیز زبانِ دانی کے ماہر تھے۔ ان کے بھائی حضرت شاہ عبد القادر نے قرآنِ پاک کا اردو ترجمہ کیا اور اس میں ”زبانِ ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف“ استعمال کی ہے ”تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو“

ان علما کی کوششوں سے صاف اور سلیس زبان کا رواج ہوا جس کی بہترین شکل ہمیں ذوق و تفکر کی مشاعری میں اور مرزا غالب کے خطوں اور

رقموں میں ملتی ہے۔ نادر شاہ کا اپنی جیب دہلی آیا تو کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے منشیوں نے تین برس اس سوچ میں صرف کر دیے تھے کہ شاہ ایران کو کیا القاب لکھا جائے۔ اس وقت القاب و آداب مقرر تھے اور تمام اوصاف اسم تفضیل کے میخے میں لکھے جاتے تھے لیکن جب نئی ضرورتوں کی صبح طلوع ہوئی تو یہ تکلفات بھی ختم ہو گئے۔ غالب نے جدید تشریح کی طرح ڈالی اور سرسید آدم نثر جدید کہلائے۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دونوں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے ان کا تصوف انسان دوستی کے آفاق گیر تصور پر مبنی ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں تو ہندوؤں کو موجد اور صاحب کتاب کہتے تھے یہ غالب کے یہاں بھی ”اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے۔ ملتیں انہم نہیں۔ ان کے منٹے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور زنار و سبب کا فرق موجود نہیں ہے۔ یہی نے خطوں میں بھی ہے لکھتے ہیں: ”میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور بھائی گنتا ہوں۔“

پروفیسر گب نے لکھا کہ جب بھی تہذیب کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہے تو تصوف نے اس کو اتنی توانائی بخشی ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکی یہ انیسویں صدی کو عام طور پر زوال کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی انحطاط سے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ہماری تہذیب کو ایسی ٹھن نہیں لگا تھا جہادی تحریک اور تصوف کے نئے مثبت رجحانات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس وقت دلی اپنی روایات سے بیگانہ اور روحانی اور اخلاقی ورثے سے بے بہرہ

نہیں تھی۔

مشکاف نے لکھا ہے کہ دہلی میں یہ شوق جہاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور شہری ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیے تھے اور اپنے گھروں سے سرکف نکل کھڑے ہوئے۔ یوں بھی اس زمانے میں علما اور ثقافت کمپنی بہادر کی ملازمت کو "حالی" اور عزت و افتخار سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خاں مومن — کسی نے بھی انگریز کی ملازمت قبول نہیں کی۔ شاہ غلام علی خانقاہ وائے تو کہتے تھے کہ ان سب کا وسیلہ معیشت مشترک ہے۔ سرسید نے نذر پیش کی تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مومن شاہ عبدالقادر کے شاگرد اور مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کی مشادی دہلی کے نامور خاندان ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد اور تملق سے پرہیز کرتے تھے اور قصیدہ گو کارہوس پیش گاہ سمجھتے تھے۔ وہ رند غزل خواں بھی ہیں۔ اور جہاد کے علم بردار بھی۔ عروج شہید و صدیق بھی چاہتے ہیں اور محبوب کی نگاہ بے حجاب بھی۔ وہ مشنوی جہاد یہ بھی لکھتے ہیں اور مشنوی قول عمیں بھی۔ یہ تضاد مومن ہی میں نہیں اس زمانے کی زندگی میں بھی تھا۔ وصل شاہان شیریں کے جوتقانے حرم میں پورے نہیں ہو سکتے تھے وہ دیوان خانے میں پورے ہوتے تھے۔ اس دور میں ایک مناجان، ایک درگاہانی منہم۔ ایک رجبو، ایک صاحب جی برابر ملتی ہیں اور رندی و زہد ہیں وہ بیر نہیں تھا جو آج ہے۔

غالب مومن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان تیار کرنے کو تیار تھے۔ ان کے مرنے پر غالب نے لکھا تھا ہے

کافر باشم اگر ہے مرگ مومن
چوں کجہ سید پوشش نہا شم عمر
سر سید نے مومن کو "یکازہ جہاں" لکھا ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و
شیفۃ ان کے شاگردوں میں تھے۔ اور شیفۃ کے متعلق مولانا حالی کی
رائے ہے :

"لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان
کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی فکر سے گر جاتا تھا اور ان کی
تعمین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی پلے
اور خود غالب کا فتویٰ ان کے متعلق یہ تھا کہ

غالب بہ فن گفتگو ناز و بہد میں ارزشش کو او

نوشست در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش کمر

مومن کے انتقال کے بعد شیفۃ آردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مرزا غالب
سے مشورہ منہن کرتے رہے۔ دونوں میں بڑی دوستی اور محبت کے تعلقات
تھے۔ جب مرزا غالب ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں قید ہوئے تھے تو
شیفۃ ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ فرماتے ہیں :

خود جہاں غلوں خودم از تم کہ بہ غم خوار می من

رحمت حق بہ لباس بشر آمد، گوئی

خواجہ بہت حد میں شہر کہ از پرکشش نے

بایہ، خویشتم در نظر آمد، گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقوہم خود من است

مگر بکرم، پہ غم از مرگ، عزادار من است

فرد کا تعلق طبقہ سے ہے اور طبقہ کا دامن اس کے سماج سے بندھا ہوا ہے۔ غالب کی اچھائیوں اور کمزوریوں کو بھی اس روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ شاہد و شمع دے وقار سے ان کا تعلق کوئی بھی ڈھکی بات نہیں۔ وقار بازی کے الزام میں وہ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ معنوب ہوئے۔ ۲۲ اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی آزدواجار میں لکھا ہے :

”سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی وقار باز پکڑے گئے خنڈ ہاشم علی خاں وغیرہ کے کہتے ہیں بڑا وقار ہوتا تھا۔ تھانہ دار قوم سے سید..... مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور کیس تراوہ۔ نواب شمس الدین خاں قابل و لمیم فہم و صاحب کے قرابت قریب میں سے ہے..... اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ نداد کریں تو چار مہینہ قید“

مئی ۱۸۴۷ء کا واقعہ اسیری اس کے بعد کا ہے۔ جس کے متعلق منشی کریم الدین نے لکھا ہے :

”ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے، ایک حادثہ ان پر جانبدار سے بڑا پڑا۔ جس کے سبب ان کو بہت رنگ لاحق سال ہوا۔ عمر ان کی اس میں قریب ساٹھ برس کی ہو گئی“

لیکن ان واقعات اسیری سے غالب کی ہشامراہ عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ان کی عظمت کے گوشے و بان روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے گزر کر تاروں کو چھو لیتے ہیں اور کائنات کی دسمنوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ شفیقتہ بڑے خوش فکر شاعر تھے اور نقد شعر میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔

ان کا تذکرہ گلشن بے خار میانہ روی اور امتدال و توازن کے لیے مشہور ہے۔ ان کو ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جل گیا۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی اور انگریزوں نے اعانتِ برمانہ کے الزام میں ان کی جائیر ضبط کر لی اور سات برس کی سزا دی۔ غائب ایک خط میں لکھتے ہیں: ”مصلیٰ خاں کا حال سنا ہو گا۔ خدا کرے مرافعوں میں جھوٹ جائے ورنہ جس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں؟“

شیفہ خوش قسمتی سے اپہل میں بری ہو گئے۔ غائب جن کی کوششوں سے شیفہ کو رہائی ملی تھی ان سے ملنے میرٹھ گئے۔ جائیداد کی واگزار اسی میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ شیفہ صبر و رضا کی دولتِ خاص سے بہرہ مند تھے۔ مالکِ رام صاحب نے ان کے منہج و استقلال کے دو عجیب واقعات لکھے ہیں۔ جس زمانہ میں وہ قید میں تھے، پایادہ، بیڑی پہننے ایک سڑک سے گزر رہے تھے اس وقت آسمان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے: ”تیری شان کریں کے قربان۔ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا!“

دوسرا واقعہ انھوں نے منشی ذکار اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ شیفہ کو سرطان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے عملِ جراحی تجویز کیا۔ وہ اُٹا اور ناقص گوشت کاٹ کاٹ کے الگ کر دیتا۔ دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے لیکن ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ ایک دن بڑے صاحبزادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے تو فرمایا ”اس جسمِ خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے“

مفتی صدر الدین آزدہ نے جو خود ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں چند درجہ چند مصائب کا شکار ہوئے تھے، اپنے مرثیہ دہلی میں شیفہ اور صہبائی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر کے جسم کو توپ سے ہاندھ کر ان کے پرچے اڑا

دیے گئے تھے۔ آزدہ لکھتے ہیں۔

روز و حشت بچے صحرای طرف لاتی ہے
سر پہ اور جوش جنوں سنگ ہے اور بچاتی ہے
مکڑے ہوتا ہے جگر، جی رہی پہ بن آتی ہے
مصلحتی خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزدہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غالب اور سرسید کے دوست فاضل عصر مولانا امام بخش صہبائی دلی کالج
میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ بغاوت کے الزام میں ان کی جو دردناک موت
واقع ہوئی اس پر سفید رومانی میں جو مرثیہ کے اشعار درج ہیں ان کو پڑھ کر
آج بھی درد کی ایک ٹیس پیدا ہو جاتی ہے۔

ندامت بجا رفت اُس نقش پاک	ملک بردیا ماند بروئے خاک
ندامت کے داد اور افسوس	دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن
بخاکش نمودند اور استہاں	دیا مرتفع شد سوی آسماں
کے فاتح ہم برو خواندہ است	لبطرح گلابی بر افشاندہ است
الہی بیا مرزا مظلوم را	کلاہ ضہیادہ پہ ملک بقا

مفتی صدر الدین آزدہ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے
زبردست عالم تھے۔ جرم بغاوت میں بقول غالب ”بہت دیر حوالات میں رہے۔
کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ رو بکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے
جہاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائیداد ضبط۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ
ترجمہ نصف جائیداد و انگریز اشت کی“

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے ”مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے مستنپ افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑاگری برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہرفن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو یک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدہ مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا یہ نہ

اس زمانے میں اکثر مشاعرے ہوتے اور ان میں فارسی آرد و غزلیں پڑھی جاتیں۔ غالب سب میں تو نہ جاتے لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب سید الدین خاں کرتے ان میں امرار سے چلے جاتے۔ انھوں نے ایک قصیدہ عرفی کے طرز میں اور گریستن کی روایت اور جناب سید الشہداء کی منقبت میں لکھا تھا۔ اس مشاعرہ میں نہ مثنوی تھے اور نہ مہجائی۔ مرزا اکوٹا مل رہا کہ فارسی کا قصیدہ ہے پڑھیں نہ پڑھیں بلکہ ”درختہ گویان را در دسرنہم“ اتفاق سے مفتی سید الدین آئندہ آگئے۔ غالب لکھتے ہیں: ”از آمدن حضرت آردوہ دل بخود بالیدوز مزمرہ دستوری یافت“ مولانا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کی پرورد آواز سے مجلس عزابن گئی اور جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ اتفاق سے سینہ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے فرمایا ”اُسمان ہم گریست“ یہ صحبتیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں درہم برہم ہو گئیں اور دلی بیواؤں سے زیادہ دیکھ بادی ہو گئی ہے

پہمن کے تحت پر جس دن شرگی کا تہل ہوتا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی یک شور تھا، غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں

بتانا باغیاں رور و یہاں فنجہ یہاں گل تھا

جس زمانے میں مرزا غالب دہلی آئے ہیں یہاں انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور گوشہ میں نفس کے کچھ آرام اور اطمینان بھی تھا۔ تہذیبی زندگی کا شیرازہ جو منتشر ہو گیا تھا، وہ ایک دفعہ پھر بند ہو گیا تھا اور اس کے قیچے میں وہ رہ نما میسر آئے جنھوں نے عہدِ بدیدہ کی گزر گاہوں کو روشن کر دیا اور ہمیں ایک نئی سادہ زبان، ایک نیا ادب، نئے اصول نقد، ایک نیا نظام تعلیم اور مذہب اور تہذیب کی مدافعت کے نئے ہتھیار دیے۔ ہم نے مغرب کے آگے فوراً سپر نہیں ڈال دی بلکہ آویزش اور پیکار سے بے کرا فہام و تفہیم اور مفاہمت و مصالحت کی تمام منزلیں طے کیں۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان علم و فن سے بچکا نہ تھا اور اس پر زوال اور نکتہ کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ کرنل سلیم نے لکھا ہے:

”دنیا میں ایسی قومیں کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ یہاں سات سال کے درس کے بعد طالب علم کے دستارِ فضیلت پانڈھی جاتی ہے اور وہ اسی طرح سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا کے متعلق گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا ایک طالب علم۔“

مرزا غالب کی دہلی میں علما میں شاہ عبدالعزیز اور مولانا فضل حق خیر آبادی اہلبا میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں اور شعرا میں مومن و شفیقہ اور ذوق و ظفر موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت فرد کی نہیں ادارے کی تھی۔

غالب بھی اس عہد کے صاحبِ نظر دانشوروں میں تھے۔ وہ اگرہ کے خم کدہ نیاز سے نکل کر دہلی آئے تو یہاں شاعروں سے سمرگ آرا ہوئے

انہوں نے ذوق کی سانی تحریک کو مانا لیکن اسے یکساں نظر بھی دی۔ کلکتہ گئے تو وہاں حایان قنیل سے برسرِ پکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزار میں کود پڑے۔ جو فیضی اور عرفی شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے زمانے سے جاری تھی۔ مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی ہنسن کا قہقہہ کھڑا ہوا جس میں وہ پورے تیس برس تک الجے رہے۔ انہوں نے انگریزوں کی خدمت میں قیود سے بچنے کے لیے جو دراصل منظم سرینیاں ہیں اور ان کو اس زمانے کے مروجہ طریقوں ہی کی نظر سے دیکھنا چاہیے یہاں بھی سوالِ شاگوئی اور مدحِ گستری یا جیتہ و سرہپہ اور مالائے مردارید سے زیادہ خاندانی حق اور وجاہت کا تھا جس کو وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی آجائے اور شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر دیا جائے لیکن اکبر شاہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہے۔ ۱۸۱۳ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو بادشاہ نے ان کو اپنے قریب کر سی دینے سے انکار کر دیا اور پھر آداب و نیاز کا یہ سلسلہ ہی منقطع ہو گیا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کا عمر ساٹھ برس کی تھی لیکن وہ انگریزوں کی نظر میں بُری طرح کھٹکتے تھے۔ انہوں نے باوجود بے بسی اور پیرائے سالی کے بھی کچی شاہی عظمت کو قائم رکھا اور اس پر آج نہیں آنے دی۔ انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ انگریز جو تہ اتار کر ان کے حضور میں حاضر ہوں لیکن انگریز ان پر طرح طرح کے ظلم کرنے پر تھے اور ان کی معاشی حالت کو کمزور کرنے کے درپے تھے۔ لارڈ ایلن براڈ

نے میدین۔ نوروز اور سالگرہ کے موقع پر نذر پیش کرنا بند کر دی۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ڈلہوزی دہلی آیا اور مارے غرور کے بادشاہ کے حضور میں سلام کو حاسر نہیں ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں زیر دست یہ لے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد جو بھی تخت نشین ہو گا وہ لال قلعہ میں نہیں رہے گا۔ اس کو بادشاہ کے بہائے شہزادہ کے لقب سے یاد کیا جائے گا اور وہ پندرہ ہزار روپے ماہوار کی معمولی پنشن کے ساتھ قطب صاحب میں زندگی بسر کرے گا لیکن ایک ہی سال کے اندر بغاوت ہوئی و اس دفتر اسکاؤ خور دو گادڑا قصاب برد مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد نواب الہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی تھی جن کے تعلقات دہلی کے نامور شاعروں اور امیروں سے بہت گہرے تھے۔ غالب کو بھی ان محفلوں میں درخورد حاصل ہوا اور وہ ان صحبتوں سے پوری طرح فیض یاب ہوئے۔ ذوق کا سکے صرف معروف ہی کے یہاں نہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی چل رہا تھا۔ غالب کے کلام میں جو سہل متنع کا رجحان اور زبان و بیان کے کشمیں کی طرف توجہ ملتی ہے وہ بھی اسی دبستان کا اثر ہے۔

۳۔ سہجولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفر نے حکیم حسن الشیر خاں کی سفارش پر غالب کو خیم الدولہ دیر الملک نظام جنگ کے خطابات دیے اور پچاس روپے ماہوار پر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت سپرد کی۔

۱۴۔ اکتوبر ۱۸۵۰ء کو استاد شہ خاقانی ہند ذوق کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی ان کے سپرد ہوئی لیکن ملک الشعراء یا اس طرح کا کوئی خطاب نہیں ملا۔ ظفر و غالب کے انداز و اسلوب میں بڑا فرق ہے اور وہ ان دونوں کے دیوانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ بہادر شاہ کا سہارا بہت کمزور تھا۔ یہ چہرا رخ معلوم نہیں کب بچو جائے۔ ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ بیمار ہوئے۔ اس وقت غالب کو اپنے مستقبل کی

طرف سے فکر ہوئی اور انہوں نے منشی پیر اسحاق کو لکھا:

”از شب عید خاقان رنجوراست۔ حال دیگر چہ رونماید و بمن کر

در سایہ دیوارش غنودہ ام، چہ رود“

اگر منشی ۱۸۵۷ء کو بغاوت شروع ہو گئی اور اس کے شعلوں نے دہلی اور

پورے اکناف ہند کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

مولانا غلام رسول قہر نے لکھا ہے ”یوں تو غالب کے الم نامریجات

کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کے بین السطور کی آرایش میں دل و جگر کھا

خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و

ماتم کا سب سے بڑھ کر دردِ ناک بابِ سلطنتِ تیموریہ کے زوال کا وہ خون

چمکاں واقعہ ہے جو عام مورخ ”غدر“ کے نام سے معروف ہے۔“ لے

غالب نے اس جذبِ یب کا مرثیہ بڑے پُرورد الفاظ میں پیش کیا ہے

اور رمزی علامتوں کے پیرایہ میں ساری خاموشی حقیقتوں کو سونپا ہے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط

دامان یا خنان و کف گل فروکش ہے

لطفِ خرام ساقی دذوقِ صدائے چنگ

یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے اک کر تو بزم میں

لے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

دارِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سودہ بھی خاموش ہے

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ایک ایجا خاصہ کتب خانہ

تیار ہو سکتا ہے لیکن اس دہلی کے حالات کا بہترین ماخذ غالب کا روزنامہ دوستوں ان کے خطوط اور وہ اشعار ہیں جن میں ان کے دل کی تمام دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔

غالب نے دستبوں میں انسانی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے انگریزوں پر جو مظالم ہوئے ان کو بیان کیا ہے اور لکھا ہے: "بیچ مشت خاک کے نمائندہ کہ از خون گل اند اماں از خواں زار نشاء" لیکن اسی کے ساتھ باغی دوستوں اور شکستہ خوردہ امیروں کی پیکلیفوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ غالب کی مجبوریوں کے پیش نظر اس روزنامے کو بین السطور میں پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ غالب نے جاہا صنعت طرازی سے کام لیا ہے اور عبارت کی تہوں میں اپنے مطالب کو چھپایا ہے۔ دوستوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں عوام شریک تھے اور یہ مرق فوجیوں کا یہ پایا ہوا ہنگامہ و آشوب نہیں تھا۔ عوام نے آخری وقت تک دلیرانہ اور مدافعتی جدوجہد کی اور اجیری دروازہ اور ترکمان دروازہ، سب رزم گاہ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ دہلی اب شہر خوشاں میں تبدیل ہو گیا تھا اور پوری مسلمان آبادی شہر بدر گردی لگتی تھی "شہر از مسلمانان تہی است شبانہ خانہ ملتے این مردم" بے چراغ اور روزانہ روزنہ دیوارم بے دودے

دوستوں لکھے کا مقصد اپنی بے گناہی ثابت کرنا اور خلعت و خطاب اور پٹیشن کی درخواست کرنا تھا۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا حصہ ان تکالیف کے بیان پر مشتمل ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں اور جن کو انھوں نے بڑے پرسوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔ غالب نے آئینہ کو ایک خاص رخ سے پکڑا ہے اور پہلی دفعہ ہندوستانیوں کے مصائب کو غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے رکھا ہے۔

غالب اس قدر کے ہنگامہ میں مع زن و فرزند، قلم و خون کے مشناور

رہے اور انہوں نے دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ اس کے بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ہزاروں دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ بیویوں کو کوئی غمخوار نہیں۔ مردوں کو کوئی عزادار نہیں!“

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

”صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جہنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں مسالک مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزدل تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جہنم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جہنم کی بعینہ شکل پہلے جہنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و تخلص یہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام جلی ماران کا محلہ لیکن ایک دوست، اس جہنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔“

مرزا غالب نے اپنے خطوں میں بار بار اور بالآخر اپنی بے گناہی اور باغیوں سے بے تعلقی ظاہر کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا اور نظر اپنی بے گناہی پر مشہر سے نکل نہیں گیا۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دہار میں حاضر

ہوتے تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سکے شعر بھی پیش کیا تھا۔ اور فتح آگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا۔ اس لیے ان کی بے گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے حسین مرزا کو جون ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

”یہاں ایک اخبار جو گوری شنکریا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھجوتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی فلاحی تاریخ احمد اللہ خاں غالب نے یہ سکے کہہ کر گزرا نا ہے

بہ نرزد سکے کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی
مجھ سے عند الملاقات صاحب کسٹرنے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے
میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر۔ بادشاہ کے بیٹے
شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا“
یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

”میں نے سکے کہا نہیں۔ اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے
کو کہا یہ گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ
معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سہان اللہ گور انداز کا بادلو
بنانا اور توہیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے
اور شاعر کے دو مصرع معاف نہ ہوں“

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ مصرعے کون سے تھے۔ تھے بھی یا نہیں، یہذا خیال
ہے کہ جو سکے غالب سے منسوب کیے گئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس
معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انہوں نے سکے بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی
گزرا تا تھا۔ اس طرح باغیوں سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے
قابل نہیں ہے۔

غالب کا سکے منشی جیون لال نے پیش کیا ہے۔ اس روز ناچہ کا انگریزی ترجمہ

مشکاف نے کیا تھا اور سنن فہمی، عالم بالا کا حال یہ ہے کہ مکہ شعر کا ترجمہ اشرفی کیا ہے اور اس انگریزی ترجمہ کا اردو ترجمہ غدر کی صبح و شام میں موجود ہے لیکن مشکاف کا ترجمہ غلط ہے اور اردو ترجمہ غلط در غلط ہے جس اتفاق سے میں نے انگلستان کے قیام میں جیون لال کے اصل اردو روزنامہ سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں اتیسویں مئی، ۱۸۵۷ء کے ذیل میں جیون لال نے لکھا ہے:

”در بار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہو کر ایک سکتہ جلوس دربارت تخت نشینی حضور گزرانا۔ اس پر اور شاموں نے بھی سکے کہے۔“

تین کے لکھنے کے بعد جیون لال نے مرزا غالب کا یہ شعر، مکہ شعر مرزا نوشہ کے عنوان سے پیش کیا ہے جو خود پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

بمژر آفتاب و لقرۃ ما

مکہ زد در جہاں بہادر شاہ

غالب نے ایک قصیدہ بھی، ۱۸۵۷ء کی بغادت کے زمانے میں اور فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا۔ منشی جیون لال نے ۳ جولائی، ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

”فتح آگرہ کے خروے سے سب بادشاہ اور اہل قلعہ خوش تھے

مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ منی تصنیف خود بادشاہ

کی طرح میں پڑھے۔“

جیون لال کے اس بیان کی تائید آگرہ کے اخبار عالم تاب سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

”مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۲ جولائی، ۱۸۵۷ء کے دن بہادر

شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے عوامی بغاوت کے زمانہ میں بہادر شاہ ظفر سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ اس سے ان کی غیرت قومی اور بادشاہ کی ہر دل عزیزی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملک میں ہر شخص بادشاہ کی غیر معمولی عزت اور احترام کرتا ہے اور ہندوستان کے تمام لوگ ان کو اپنا جائز آقا اور فرماں روا سمجھتے ہیں۔

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں سے لڑائی ضرور لڑی تھی لیکن نہ کوئی بد عہدی کی تھی اور نہ کوئی غداری اور بغاوت کی تھی۔ اس نے تو صرف اس حق پر اصرار کیا تھا جو اس کو گیارہ پشتوں سے ملتا چلا آیا تھا۔ انگریزوں نے جو اس پر دلوں ان خاص میں ۲۴ دن تک مقدمہ چلایا وہ بھی صریحاً بے انصافی تھی اور قہر و ہند میں جو مظالم کیے وہ بھی کسی طرح معاف نہیں کیے جاسکتے۔ رنگون میں قید تہائی تھی کوئی ہر نہ بد نہیں مار سکتا تھا۔ جب بیماریاں بہت بڑھی تو حکیم کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دفن کے بعد گوروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھوڑوں سے قبر کو اس طرح زمین کے برابر کر دیں کہ نام و نشان تک باقی نہ رہے انہوں نے اس کی خود پیش گوئی کی تھی۔

پس ہرگز، قبر پر اسے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے

وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشان او سے ٹھوکروں سے اڑا دیا

انگریزوں نے اس بات سے بھی ممانعت کر دی تھی کہ نہ کوئی قبر پر جائے اور نہ فاتحہ پڑھے۔ مرحوم بادشاہ نے ایک شعر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا فرماتے ہیں۔

کوئی آکے پھول چڑھائے کیوں کیوں آکے شمع جلائے کیوں

کوئی بہر فاتحہ آئے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

غالب نے بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"۴ نومبر ۱۸۵۷ء مطابق ۳۱ جمادی الاول سالِ مال، جمعہ کے دن

ابوالفضل سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ اور قیدِ جسم دونوں سے آزاد

ہو گئے۔ اٹا اٹلہ و اٹا ایلہ برا جعون یا

کہنے کو یہ چند لفظ ہیں لیکن ان کے پیچھے درد ہی درد ہے۔ یا سہی یا سہی ہے

دل تاجگر کو ساحلِ دریا نئے خوں سے اب

بناوت کے زمانے میں جب جرنیل حکم نافذ تھا۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف

کو انگریزوں نے گولی مار کے ہلاک کر دیا۔ ہمیں یہ اطلاع معین الدین حسن خاں کے

روزنامے سے ملی ہے جو شہباز دہلی و یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکا

ہے لیکن غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہوئے۔

انہوں نے دستنبو میں صرف یہ لکھا ہے :

"۱۸ اکتوبر کو پیر کے دن وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خوشخبری

لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا (یعنی یوسف مرزا) پانچ دن تیز

بخار میں مبتلا رہا اور اسی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت

ہو گیا۔ پانی۔ خصال۔ رومال۔ گورکن۔ اینٹ۔ چوٹے۔ گارے

وغیرہ کا ذکر چھوڑتے۔ یہ بتاتے کریں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں

لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں۔ بازار میں اچھا

میرا۔ کسی قسم کا پٹر انہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی

شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے

لے جا کر جلا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ دو تین

شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں چہ جائے کہ میت کو شہر سے

باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے

کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیلے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے
دونوں گروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین
سفید چادریں اس گھر سے لے گئے۔ ان میں لیٹا اور اس
مبجد میں جو مکان کے برابر تھی۔ زمین کھودی۔ میت کو اس میں رکھا
اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے ۛ

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوا رہ قبضہ ہو گیا لیکن یہ تاریخ
کی بڑی ہوناک لڑائی تھی۔ اہل دہلی نے بڑی ہمت اور بہادری سے
ایک ایک انچی کے لیے جان دی۔ اور پورا شہر رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ لڑنے
نے لکھا ہے کہ ہم ان پدماشوں کا صحیح نشانہ مارتے اور توپوں کے تیز چلانے
میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فتح کے بعد قتل عام شروع ہو گیا۔ ہر مسلمان کو باغی
قرار دیا گیا اور پوری آبادی شہر سے نکال دی گئی۔ یہ تجویز بھی تھی کہ سارے
شہر کو تہ خاک اور ہامع مسجد کو مسمار کر دیا جائے تاکہ بقول اہل کرم مسلمانوں کو
حیرت ہو اور ان کے مذہب کی تہذیب ہو۔ یہ بھی تجویز تھی کہ فتح پوری کی مسجد میں
فوج کو ٹھہرایا جائے اور زینت المساجد میں ایک بڑا تنور خانہ قائم کر دیا جائے۔
اس وقت غالب پر جو جراثیم صبح کی مانند تھے کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ تاہم
ہے۔ ایک دور ختم ہو گیا تھا اور دوسرا شروع ہوا تھا جو پہلے سے قطعی مختلف
اور معاندانہ تھا۔ غالب نے دستبنو میں لکھا ہے۔

"جن کو پچانسی دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا

ہے ۛ
معض پچانسی ہی نہیں دی گئی بلکہ بعضوں کی کھال کھینچ لی گئی، بعض کو زندہ بھلا
دیا گیا۔ بعض کو توپ کے ٹکڑے سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعض کو قید میں سزا دیا
گیا۔ غرض انگریزوں کے انتقامی مظالم سے "جان و مال و ناموس و مکان و
کیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے ۛ

نہ بازار نہ نہر

۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو چند گورے غالب کے مکان میں گھس آئے اور ان کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے سامنے لے گئے اس وقت کسی مسلمان کو شہر میں مہنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرنل براؤن نے پوچھا ”تم مسلمان ہو؟ مرزا نے کہا۔ آدھا۔ فرمایا کیا مطلب؟ کہنے لگے شراب پیتا ہوں سو رہیں کھاتا۔“

یہ گرفتاری اور باز پرس معمولی بات نہیں تھی۔ دلی کے احکام، تھنا و قدر کے احکام تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور نقش جاہ نظر نہیں آتا تھا لیکن انہوں نے اس پہل صراط پر بھی۔ نظافت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنایا۔ اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں جب موج خون ہمارے سر سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں ایک حوصلہ اور ہمت عطا کی۔ یہ قصا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی۔ اب سر لشکری کا موقع نہیں تھا۔ صرف سختی کا موقع تھا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ”آئینہ زد و دن و صحت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ یہی وجہ ہے کہ تو راخیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس قلم میں تلوار کی سی تیز روشنی اور برقی ہے۔ اسی طرح ان کی نظافت میں وہ شوخ اور ذہین ذہانت اور دیدہ وری ہے جو پیکر الفاظ میں روح بھونک دیتی ہے۔ ایک فلسفیانہ بے نیازی ہے۔ کلیت اور مرثیت نہیں۔“

خدر کے بعد غالب کے سارے ذرائع آمدنی مسدود ہو گئے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ۵۳ برس کا فیشن۔ تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ ایک وہ منظوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملے گا۔ علی کا بندہ ہوں۔ قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے۔ نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

غالب نے مجبور ہو کر انگریز حکام کو فیشن کی بازیاں کے لیے لکھا۔ قیید سے نظم کیے۔ عرضیاں کیجیں اور ۱۸۶۰ء میں جا ک فیشن کا پتھر روپیہ وصول بھی ہوا۔

رام پور کی سرکار نے بھی سو روپے ماہوار مقرر کر دیے تھے لیکن ان مواقع پر غالب کو خالصے خوش آمداد خطوط لکھنے پڑے اور بندگی میں بھلا نہ ہوتا جبکہ اور معبود کے لیے شرمناک ہے۔

غدر کے بعد غالب ایک عرصہ تک پیشین خلعت و خطاب اور دربار و لمبر کے قصبے میں گرفتار رہے۔ جب ان الجنتوں سے کچھ نجات ملی تو وہ عوارض قساد خون میں مبتلا ہو گئے اور پھوڑوں کی کثرت سے سرو خرقاں ہو گیا اور ملاقت نے جواب دے دیا۔ ۵ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۳۷۷ میں میرا نہ مرنا مرق میری تکذیب کے واسطے تھا مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبرائی ہے جس طرح ملائم قفس میں۔ کوئی شغل۔ کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجلس۔ پسند نہیں کتاب سے نفرت۔ شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آن روز کز این منزل دیراں بروم "

آخر عمر میں مرزا غالب کو مالی دشواریوں اور مسلسل بیماریوں نے زندہ در گور کر دیا تھا لیکن اس حیوانِ ظریف کی بدلتہ سنی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرنے سے ایک دن پہلے نواب غلام الدین لوہارو نے حال پوچھا تھا۔ انھیں جواب دیا۔ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدمی روز میں ہسپتالوں سے پوچھنا۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے"

غالب نے کبھی مصائب کے آگے ہار نہیں مانی اور وہ ہر حال میں پُر امید رہے۔ ان کی انسان دوستی۔ ان کی درد مندی۔ ان کی فراخ دلی۔ ان کی دیدہ وری۔ ان کی سنجیدہ نظرافت اور ان کی مشکفہ متانت ہماری تہذیب کا بہترین سرمایہ اور ان کی شخصیت ہمارے ادب کی سب سے دل کش اور قد آور

شغفیت ہے۔

قمریاں یاس غلط کردہ خودی دارند
 ورنہ بیچ سرو دریں بارغ باند ام تو نیست
 ان کی یہ فزل لکھروں کا اختتام ہے عہد جدید کا اعلان اور صبح مید
 کی نوید ہے۔ انھوں نے نئے زمانے کی اور نئی قدروں کی اس وقت
 تائید کی اور صبح کی بشارت دی جب سرسید اور رام چند کو بھی اس کی
 ہمت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے میں ان کے اشعار کو بڑھوں گا بعد میں ترجمہ
 کروں گا:

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم داوند
 شمع کشتند وز خورشید نشام داوند
 رخ کشوند و لب ہرزہ سرا بلبستند
 دل رلودند و دو چشم بنگرانم داوند
 سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
 ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم داوند
 گہرا زایت مشامان علم برچیدند
 بومنی جامہ غنیمت فشانم داوند
 افسر از تارک ترکان پشتگی بردند
 یہ سخن نامیہ فر کیا نم داوند
 گوہرا ز تاج گستند و بدافش بستند
 ہرچہ بردند برپیدا یہ نہانم داوند

انھوں نے بجے اندھیری رات کے اندھیرے میں صبح ہونے
 کی خوش خبری دی۔ انھوں نے شمع بجھا دی اور سورج کے طلوع
 ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ جب آتش جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے

آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جب بت خازن گھر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دے دی۔ شام ان علم کے مجنڈوں کے موقی اٹا رہے اور اس کے عوم میں مجھے خامر گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج ٹوٹ لیا اور تجھ کو شاعری میں اقبال کیانی مرحمت فرمایا۔ تاج میں سے موقی توڑ لیے ان کو علم و دانش میں جڑ دیا۔ یعنی جو کچھ علی الاعلان ٹوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دے دیا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ ہر جہاں کتب کو حسب ضرورت کیلین دیا جائے گا۔

المو لال جی کوئی ایک ادبی سوانح



مصنف:
ایس۔ عارف طیل
صفحات: 280
قیمت: - 72 روپے

شرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت



مصنف:
ایوانکلام کماکی
صفحات: 382
قیمت: - 124 روپے

اردو کے ادبی معرکے



مترجم:
ڈاکٹر محمد یعقوب عاتق
صفحات: 448
قیمت: - 85 روپے

دہلی



مترجم:
پروفیسر خواجہ احمد قادری
صفحات: 88
قیمت: - 12 روپے

اردو کی کہانی



مترجم:
سید اظہار حسین
صفحات: 104
قیمت: - 21 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب



مترجم:
پروفیسر محمد حسن
صفحات: 600
قیمت: - 156 روپے



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066